درس ۲۰

سورۃ العصر میں بیان کردہ شرائطِ نجات
میں سے آخری شرط
صبر و مصابرت
سورۂ آل عمران کی آخری آیت کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا وَرَابِطُوۡا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۲۰۰﴾﴾ (النساء) ...... صدق اللّٰہ العظیم

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس ان مجالس میں ہو رہا ہے اس کا پانچواں حصّہ مباحثِ صبر و مصابرت پر مشتمل ہے۔ اس کے لئے ایک نہایت جامع اور موزوں عنوان کے طور پر سورۂ آل عمران کی آخری آیت کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ایمان والو! صبر کی روش اختیار کرو اور صبر کے معاملے میں (اپنے مخالفین اور اپنے دشمنوں پر) بازی لے جاؤ اور (ہر جانب سے چوکس اور چوکنے رہ کر) حفاظت کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

اس آیۂ مبارکہ کا اختتام ''فلاح'' کے لفظ پر ہوا اور یہاں فلاح کا ذکر مؤمن کے اصل مقصود کی حیثیت سے آیا ہے۔ فلاح کے معنی اور مفہوم پر اس سے پہلے اس منتخب نصاب میں سورۂ مؤمنون کی پہلی آیت ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾﴾ کے حوالے سے

مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ یہاں سب سے پہلے تقویٰ کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے۔ تقویٰ قرآن حکیم کی ایک نہایت جامع اصطلاح ہے۔ تقویٰ کا مادہ ''و' ق' ی'' ہے۔ اس کا لغوی مفہوم ہے: بچنا۔ سوال یہ ہے کہ کس شے سے بچنا؟ مراد ہے کہ اس دنیا میں اللہ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچنا' آخرت میں اللہ کے غضب اور اس کی سزا سے بچنا۔ گویا تقویٰ پورے دینی عمل کے لئے یا سلوکِ قرآنی کے لئے ایک مستقل روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح دنیا میں ہم ع '' ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں'' کے مصداق بہتری کے حصول کی کوشش کرتے ہیں' دین میں بھی خوب تر کی طرف پیش قدمی کرنا ہمارا مقصودِ حیات ہونا چاہیے۔ اسی لئے فرمایا: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ کہ نیکیوں میں' خیر میں' بھلائی میں' ایمان میں' عمل صالح میں مسلسل ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہو۔ اس کے لئے جو قوّت محرکہ درکار ہو سکتی ہے' قرآن اسے لفظِ تقویٰ سے تعبیر کرتا ہے۔

اس ضمن میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۳ بہت اہم ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کے علمی و عملی ارتقاء کا دارومدار روحِ تقویٰ پر منحصر ہے۔ فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾

کہ جب کھانے پینے کی چیزوں میں حلت و حرمت کا پورا ضابطہ بیان ہو گیا تو کچھ مسلمانوں کے دل میں ایک تشویش سی پیدا ہوئی کہ جو چیزیں ہم پہلے استعمال کر چکے ہیں' ایسا تو نہیں کہ ان ناجائز چیزوں کے اثرات ہمارے وجود میں باقی رہ جائیں اور وہ ہمارے اعمالِ صالحہ پر اثر انداز ہوں! ان کی اس تشویش کے ازالے کے لئے فرمایا کہ اہل ایمان نے اس سے پہلے جو کچھ کھایا یا پیا ہے اس کی ان سے کوئی باز پُرس نہیں' اس سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا' جبکہ انہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی۔ اس کو اگلے جملے میں یوں بیان فرمایا: ﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کہ جب انہوں

نے تقویٰ کی روش اختیار کی‘ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ۔ ﴿ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا﴾ پھر مزید تقویٰ ان میں پیدا ہوا‘ اور انہیں ایمان میں مزید ترقی حاصل ہوئی ...... یہاں ایمان کے دو مراتب یا مدارج کی جانب اشارہ فرمایا۔ ایک ایمان کا اوّلین یا ابتدائی مرحلہ ہے جس میں عمل صالح کا ذکر ایک جداگانہ entity کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور دوسرا ایمان کا اس سے برتر اور اعلیٰ مرتبہ ہے جہاں عمل اور ایمان ایک وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں‘ لہٰذا پھر عمل کے دوبارہ ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ مزید فرمایا: ﴿ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا﴾ پھر ان میں تقویٰ اور بڑھا اور نتیجتاً وہ درجۂ احسان پر فائز ہو گئے ۔ اور یہ تقویٰ کی معراج ہے ۔ ﴿وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَo﴾ ’’اور اللہ تعالیٰ محسنین سے محبت کرتا ہے۔‘‘ تو سورۂ آل عمران کی اس آخری آیت کے آخری حصے ﴿وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ میں تو گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو گیا‘ اب اس کے پہلے ٹکڑے پر توجہ مرتکز کیجئے جو منتخب نصاب میں ہمارے آج کے موضوع کے اعتبار سے اہم تر ٹکڑا ہے۔

فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا﴾ آیت کے اس حصے میں ’’صبر‘‘ ہی سے دو فعل امر وارد ہوئے ہیں‘ دو حکم ہیں کہ جو مسلمانوں کو دیئے گئے ۔ ایک ’’اِصْبِرُوْا‘‘ یعنی صبر کرو اور دوسرے ’’صَابِرُوْا‘‘۔ یہاں یہ ’’بابِ مفاعلہ‘‘ سے صیغۂ امر ہے ۔ جس طرح اس باب میں قتل سے ’’مقاتلہ‘‘ اور جہد سے ’’مجاہدہ‘‘ کے مصادر آتے ہیں اسی طرح صبر سے مصدر ہوگا ’’مصابرہ‘‘ ۔ صبر ایک یک طرفہ عمل ہے ۔ صبر کے معنی ہیں اپنے آپ کو روک کر رکھنا‘ تھام کر رکھنا اور اس کے دو پہلو ہیں ۔ ایک یہ کہ اپنی منزل اور اپنے ہدف کے تعین کے بعد انسان پوری ثابت قدمی سے اس کی طرف پیش قدمی جاری رکھے ۔ کوئی مخالفت‘ کوئی رکاوٹ‘ کوئی تشدد اسے اپنے مقصد اور اپنی منزلِ مقصود کی جانب پیش قدمی سے روک نہ سکے ۔ اور دوسرا پہلو یہ کہ کوئی طمع‘ کوئی لالچ‘ یا کسی اعتبار سے مرغوباتِ نفس کی کوئی کشش بھی اس کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے ۔ یہ دونوں پہلو ’صبر‘ میں مضمر ہیں ۔

محض صبر نہیں‘ مصابرت درکار ہے

جیسا کہ اس سے پہلے بارہا عرض کیا جاچکا ہے‘ ایک بندۂ مؤمن جس ماحول میں ایمان اور عمل کی منزلیں طے کرتا ہے وہاں کوئی خلا نہیں ہوتا۔ اگر اس کا ایک مخصوص نظریہ ہے تو اسی معاشرے میں اور بھی نظریات کارفرما ہیں‘ جہاں اس کا ایک مسلک ہے وہاں دوسرے مسالک کے لوگ بھی موجود ہیں۔ یہ دنیا مختلف نظریات کی ایک آماج گاہ ہے‘ یہاں تو کشمکش بلکہ کشاکش (struggle) ہو کر رہے گی۔ چنانچہ ’’صبر‘‘ کے بعد دوسرا لفظ یہاں آیا ’’وَصَابِرُوْا‘‘۔ مصابرہ کا لفظ مجاہدہ اور مقابلہ کے وزن پر آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اہلِ کفر اپنے نظریات کے دفاع میں صبر کریں گے‘ اہلِ شرک اپنے معبودانِ باطل کے لئے ایثار کا وطیرہ اپنائیں گے‘ اے اہلِ ایمان! تمہیں اللہ کے لئے‘ اس کے دین کی سربلندی کے لئے صبر کرنا ہے اور صبر میں ان سب معاندین پر بازی لے جانا ہے۔ جب تک تم انہیں اس مقابلۂ صبر میں نیچا نہ دکھاؤ گے‘ آگے نہ بڑھ سکو گے۔ ہونا یہ چاہئے کہ اس تصادم‘ کشمکش اور ٹکراؤ میں تمہارا صبر دوسروں کے صبر پر سبقت لے جائے‘ تمہارا ایثار و قربانی دوسروں سے بڑھ جائے‘ تم اپنے مقصد کے حصول کے لئے جان و مال نچھاور کرنے میں دوسروں پر بازی لے جاؤ۔ اگر تم نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی اور ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ کا معاملہ صرف اسی ایک صورت میں ممکن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیۂ مبارکہ ہمارے منتخب نصاب کے اس پانچویں حصّے کے لئے نہایت موزوں اور بہت جامع عنوان کی حامل ہے۔ اب آیئے ذرا ایک نگاہِ بازگشت ڈالیں کہ صبر کا ذکر اس سے پہلے ہمارے اس منتخب نصاب میں کہاں کہاں ہوا ہے۔

گزشتہ اسباق میں ’’صبر‘‘ کا ذکر

ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ منتخب نصاب کا پہلا حصّہ چار جامع اسباق پر مشتمل تھا اور

ان چاروں اسباق میں چوٹی کی چیز اور آخری منزل صبر ہی کی تھی۔ سورۃ العصر کی طرف آ یئے' سورۃ کا اختتام ''صبر'' ہی کے لفظ پر ہوا:

﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾

آ یۂ برکو دیکھئے' نیکی اور تقویٰ کا نقطۂ عروج (climax) وہاں کن الفاظ میں بیان ہوا: ﴿وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ﴾ ۔اگلے سبق یعنی سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر نگاہ ڈالئے' آیت ۱۷ میں صبر کا ذکر موجود ہے: ﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ﴾۔سورۂ حٰم السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ پر توجہ کو مرکوز کیجئے' وہاں بھی صبر کا ذکر بڑے اہتمام سے ہوا: ﴿وَمَا یُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ o﴾ ان چاروں جامع اسباق میں جس بلند ترین اور آخری منزل کی نشان دہی کی گئی وہ صبر ہی ہے۔ ان چاروں مقامات میں صبر کا وہ پہلو زیادہ پیش نظر ہے جس سے انسان اس وقت دوچار ہوتا ہے جب وہ تواصی بالحق' دعوت الی اللہ اور ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کا فریضہ سرانجام دے رہا ہو۔ ظاہر بات ہے کہ حق کی بات کہنی ہے تو طبیعت میں سہارا اور تحمل کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ''اَلْحَقُّ مُرٌّ'' یعنی سچ کڑوا ہوتا ہے۔ سچائی عام طور پر قابل قبول نہیں ہوتی۔ لہٰذا تکالیف آئیں گی' ان کو جھیلنے کے لئے صبر کا بھرپور مادہ ہونا چاہئے۔ پہلے سے تیار ہو جاؤ کہ یہ راستہ پُر خار ہے' اس میں مخالفتوں کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں' یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ اس کے بارے میں سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں ہم یہ پڑھ آئے ہیں: ﴿اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ کہ یہ کام بڑی ہمت کے متقاضی ہیں۔

اس کے بعد عمل صالح کی تفاصیل پر مشتمل جو حصّہ سوم ہمارے اس منتخب نصاب میں آیا وہاں سورۃ الفرقان میں لفظ صبر ایک دوسری شان کے ساتھ وارد ہوا تھا۔ فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جن کو جنت کے بالا

خانے عطا کئے جائیں گے اس صبر کے عوض جو انہوں نے کیا'' ...... یہاں لفظ صبر درحقیقت انسانی شخصیت اوراس کی سیرت وکردار کے ایک نہایت ہمہ گیر پہلو کی طرف اشارہ کرر ہا ہے۔مطلب یہ ہے کہ ایمان پر کاربند رہنا بھی ممکن نہیں جب تک کہ صبر نہ ہو‘عمل صالح کے بنیادی تقاضے بھی پورے نہیں ہوسکتے جب تک انسان میں صبر کا مادہ نہ ہو۔اپنے جذبات کو تھامنا بھی صبر ہی سے ممکن ہوتا ہے اور خواہشات کی لگامیں بھی صبر ہی کے ذریعے کھینچی جاسکتی ہیں۔سوۃ النازعات کی آیت:﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىo﴾ میں صبر ہی کا تو بیان ہے کہ خواہشات کو دبانا‘ شہوات کو لگام دینا اور مرغوباتِ نفس کے حصول کے لئے طبیعت میں جو طوفان بپا ہے اس کو روک کر رکھنا ہوگا‘ تبھی ایمان پر گامزن رہنا اور عملِ صالح کے ابتدائی تقاضے پورے کرنا ممکن ہوگا‘ تبھی اس راہ میں آگے قدم بڑھانے کا امکان ہوگا۔ پھر جب احقاقِ حق اور ابطالِ باطل‘ یا بالفاظ دیگر اعلاءِ کلمۃ اللّٰہ اور غلبۂ دین کی جدوجہد کا مرحلہ آتا ہے تو ظاہر بات ہے یہاں نمایاں ترین وصف صبر اور مصابرت ہی کا ہے۔

اسی مفہوم کی تائید سورۂ مؤمنون میں اس طرح سے ہوتی ہے کہ قیامت کے روز اللّٰہ تعالیٰ ان کافروں سے جو دنیا میں حق کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے رہے‘ یہ فرمائیں گے:﴿اِنِّیْ جَزَیْتُهُمُ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا﴾ کہ یہ لوگ جن کا تم دنیا میں استہزاء اور تمسخر کرتے رہے‘ جن کی عملی جدوجہد میں تم رکاوٹ بنتے رہے‘ جنہیں کمزور دیکھ کر تم نے دبائے رکھا اور وہ کمالِ ہمت و بردباری سے صبر کا دامن تھامے رہے‘ دیکھو آج اس صبر کی بدولت مَیں انہیں کیسا عمدہ بدلہ دے رہا ہوں‘ کیا اعلیٰ مقامات انہیں حاصل ہو رہے ہیں!! حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں صبر کا ذکر اس طور سے کیا گیا ہے کہ سلوکِ قرآنی میں صبر بنیادی اور لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے اور صراطِ مستقیم کا ہر ہر مرحلہ صبر ہی کے ذریعے طے پاتا ہے۔اس پورے عمل کی روحِ رواں‘ اس کے جذبۂ محرکہ‘ اور اس کی شرطِ ناگزیر کے طور پر صبر ہی کا ذکر ہوتا ہے۔اب آیئے اس پہلو سے جائزہ لیں کہ

ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے قرآن مجید میں صبر کا ذکر کس طور سے آیا ہے!۔

نبی اکرم ﷺ کو صبر کی تاکید و تلقین

قرآن حکیم کی ابتداءً نازل ہونے والی سورتوں میں ہر جگہ صبر کا لفظ فعل امر بصیغہ واحد وارد ہوا ہے اور اس کے مخاطب اوّلین خود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ پر جب وحی کا نزول شروع ہوا تو فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے پہلے حکم کے ساتھ ہی صبر کی ہدایت بھی نازل ہوئی۔ فرمایا گیا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ۝۳ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ ۝۴
وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ ۝۵ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ ۝۶ وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ ۝۷﴾

دیکھئے آخری آیت میں صبر کا حکم موجود ہے۔ جس راہ پر آپ نے قدم رکھا ہے یہ اس کا لازمی تقاضا ہے۔ اب جھیلنا ہوگا' برداشت کرنا ہوگا' تحمل کا مظاہرہ کرنا ہوگا' مصائب' تکالیف اور آزمائشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔ چنانچہ ابتدائی ہر وحی میں نمایاں طور پر لفظ صبر کہیں حکم کے انداز میں اور کہیں تلقین و ہدایت کے پیرائے میں آتا ہے۔ سورۂ قلم کا اختتام ان الفاظِ مبارکہ پر ہوتا ہے: ﴿فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ وَلَا تَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ کہ اے نبی! اپنے ربّ کے حکم کا انتظار کیجئے اور اس کے لئے صبر کی روش پر کاربند رہئے' خود کو تھامے رکھئے' روکے رکھئے اور اس مچھلی والے یعنی حضرت یونسؑ کے مانند نہ ہو جایئے جنہوں نے کچھ جلدی کی تھی۔ کہیں فرمایا جاتا ہے: ﴿فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ وَلَا تُطِعْ مِنْھُمْ اٰثِمًا اَوْ کَفُوْرًا۝﴾ کہ اپنے ربّ کے لئے صبر کیجئے' اس کے حکم کا انتظار کیجئے اور ان گناہوں میں ڈوبے ہوئے منکر لوگوں کی باتوں میں نہ آجایئے۔ کہیں صبر کی تلقین ان الفاظ میں کی جاتی ہے: ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا۝﴾ پس صبر کیجئے خوبصورتی کے ساتھ!...... ایک مجبوری کا صبر ہوتا ہے۔ مثلاً کسی نے آپ کو گالی دی اور آپ نے جواباً گالی دے دی اور دعویٰ یہ ہے کہ میں صبر کر رہا ہوں! یہ صبر جمیل نہیں ہے۔ جھیلئے' برداشت کیجئے اور خوبصورتی کے ساتھ صبر کیجئے۔ کہیں حکم ہوتا ہے: ﴿فَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ﴾ صبر کیجئے اور صبر کے لئے آپ

کا سہارا اللہ کی ذات ہے۔ اللہ سے قلبی تعلق اور اللہ پر توکل واعتماد' یہی آپ کے لئے صبر کی اصل بنیادیں ہیں۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ صبر کیجئے جیسے کہ ہمارے صاحبِ عزیمت رسول صبر کرتے رہے ہیں۔ سورۃ العنکبوت میں حضرت نوحؑ کا ذکر ہے کہ ساڑھے نو سو برس تک دعوت دیتے رہے۔ مخالفت ہوئی' انکار واعراض اور مسلسل تمسخر واستہزاء ہوا' لیکن وہ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں لگے رہے' ان کے پائے ثبات میں کہیں لغزش نہ آئی۔ یہ ہے قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں میں صبر کا حکم جو بتکرار واعادہ نبی اکرم ﷺ کے لئے وارد ہوا۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ آنحضور ﷺ نے جب دعوت کا آغاز فرمایا تو سب سے پہلا ردعمل جو اس معاشرے کی جانب سے ظاہر ہوا وہ تمسخر واستہزاء کی صورت میں تھا۔ اس میں کہیں کہیں ظاہری ہمدردی کا عنصر بھی شامل ہوتا تھا' کہ نہ معلوم بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا' اچھے بھلے آدمی تھے' ہمیں تو ان سے بڑی اچھی توقعات تھیں' بڑی اچھی اُمیدیں ان سے وابستہ تھیں' نہ معلوم کیا ہوا ہے۔ اسی طرح ''نَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ'' اور ''نقلِ کفر کفر نہ باشد'' کوئی کہتا کہ خلل دماغی کا کوئی عارضہ لاحق ہو گیا ہے' کوئی جنون کا عارضہ ہو گیا ہے یا کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ یہ باتیں استہزاءً بھی کہی گئیں اور تمسخر کے انداز میں بھی' ہمدردانہ بھی کہی گئیں اور تاسف کے ساتھ بھی۔ ان سب باتوں کے جواب میں نبی اکرم ﷺ کو صبر کرنے' جھیلنے اور برداشت کرنے کا حکم دیا گیا۔ انتیسویں پارے کی دوسری سورۃ ''ن'' جسے سورۃ القلم بھی کہتے ہیں' کی ابتدائی آیات کے پس منظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نبی اکرم ﷺ معاندین کے اس طرزِ عمل پر بہت ملول اور غمگین ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

﴿نٓ وَالۡقَلَمِ وَمَا یَسۡطُرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ مَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ بِمَجۡنُوۡنٍ ﴿۲﴾ وَاِنَّ لَكَ لَاَجۡرًا غَیۡرَ مَمۡنُوۡنٍ ﴿۳﴾ وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ﴿۴﴾ فَسَتُبۡصِرُ وَیُبۡصِرُوۡنَ ﴿۵﴾ بِاَیِّىكُمُ الۡمَفۡتُوۡنُ ﴿۶﴾﴾

’’گواہ ہے قلم اور جو کچھ کہ یہ لکھتے ہیں۔اے نبی! آپ (ﷺ) اپنے ربّ کی رحمت اور نعمت سے مجنون نہیں ہیں (آپ ملول و غمگین اور رنجیدہ نہ ہوں‘ آپ ان پاگلوں کے کہنے سے کہیں پاگل تھوڑا ہی ہو جائیں گے) اور یقیناً آپ کے لئے وہ اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا اور آپ تو اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہیں (کیا دنیا نے ایسا پاگل اور ایسا مجنون کبھی دیکھا ہے جو خلق عظیم کا پیکر ہو‘ کردار اور شرافت میں کوئی اس کا ہمسر نہ ہو؟) یہ کوئی دن کی بات ہے کہ آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے (ساری دنیا دیکھ لے گی) کہ کس کا دماغ اُلٹ گیا تھا (کس کو دماغ کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔جلد ہی حقیقت سامنے آ جائے گی)‘‘۔

سورۂ نون کا اختتام اس آیت پر ہو رہا ہے جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے کہ: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ کہ اے نبیؐ جھیلئے‘ برداشت کیجئے‘ اپنے ربّ کے حکم کا انتظار کیجئے کہ وہ کب فیصلہ سناتا ہے اور حضرت یونسؑ کی طرح کوئی عاجلانہ اقدام نہ کیجئے۔

ابتدا میں تو یہ تمسخر واستہزاء کسی درجے میں کچھ ہمدردانہ انداز کا تھا‘ لیکن جیسے جیسے بات آگے بڑھی تمسخر واستہزاء کا معاملہ سختی اور شدت کا روپ دھارتا چلا گیا۔ چنانچہ اس کی جھلک سورۂ مزمل کی اس آیت کے پس پردہ نظر آتی ہے: ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًاO﴾ کہ اے نبیؐ! صبر کیجئے ان کڑوی باتوں پر جو یہ کہہ رہے ہیں اور ان سے قطع تعلق کر لیجئے‘ لیکن یہ قطع تعلقی ہجرِ جمیل ہو۔اگلی آیت میں بھی یہی مضمون بیان ہوا: ﴿وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًاO﴾ چھوڑ دیجئے مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو جو بڑے دولت مند ہیں‘ سرمایہ دار ہیں‘ صاحب اقتدار اور صاحب وجاہت لوگ ہیں‘ ہم ان سے نپٹ لیں گے۔آپ اپنی توجہ کو اپنی دعوت و تبلیغ پر مرتکز رکھئے۔آپ ان کی جانب التفات نہ فرمایئے‘ ان سے نپٹنے کے لئے ہم کافی ہیں۔ ﴿اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًاO وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًاO﴾ ہمارے پاس ان کے لئے عذاب کا پورا سامان مہیا ہے جو منہ کھولے ان کا منتظر ہے۔یہ

کہیں بچ نہ نکلیں گے۔لیکن آپ ان سے چشم پوشی فرمائیے۔

ایک اور مقام پر بڑے خوبصورت انداز میں یہ بات بیان فرمائی : ﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ﴾ کہ آپ ان منکروں سے اپنی توجہ کو ہٹا لیجئے' ان مخالفین کی جانب ملتفت ہی نہ ہوں' ان کے استہزاء کی طرف توجہ ہی نہ کیجئے' آپ لگے رہیے دعوت وتبلیغ اور فریضہ رُسالت کی ادائیگی میں' انذاراور تبشیر میں۔﴿فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ ط لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ (سورۃ الغاشیہ) آپ یاددہانی کراتے رہیے' آپ کا کام یاددہانی کرانا ہے' آپ ان پر نگران اوران کے ذمہ دار نہیں ہیں' آپ سے یہ باز پُرس نہیں ہوگی کہ انہوں نے کیوں آپ کی دعوت پر لبیک نہ کہا!......سورۃ الاعلیٰ میں یہی بات ایک اور انداز سے آئی : ﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى o سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى o﴾ کہ آپ تذکیر کرتے رہیے اگر وہ تذکیر مفید ہو' اس کے مفید نتائج ظاہر ہوں۔جس کے دل میں کچھ بھی اللہ کا خوف ہے' کسی بھی درجے میں اسے اپنے خالق اور مالک اوراس کے حضور میں لوٹنے کا خیال ہے تو وہ اس سے نصیحت اخذ کرلے گا اوراس تذکیر سے فائدہ اٹھائے گا۔

صحابہ کرام کے لئے صبر کے مرحلے کا آغاز

بہرحال صبر کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کو سب سے پہلے تمسخر واستہزاء اور مذاق کے مقابلے میں جمے رہنے' ڈٹے رہنے' جھیلنے' برداشت کرنے اور ثابت قدم رہنے کا حکم ہوا۔تاریخی اعتبار سے یہ بات جان لینی چاہئے کہ تقریباً تین برس تک نبی اکرم ﷺ کی دعوت اندر ہی اندر باہمی گفتگوؤں اور انفرادی رابطوں (personal contacts) تک محدود رہی۔ابھی لوگوں کو خطرے کا زیادہ احساس نہیں ہوا۔نبوت کے چوتھے برس لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ دعوت تو ایک بہت بڑے چیلنج کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ع ''نظامِ کہنہ کے پاسبانو' یہ معرضِ انقلاب میں ہے''۔تب ان کے کان کھڑے ہوئے اورسوچنے لگے کہ آپ کا راستہ روکنا ہوگا' جسے ہم مشتِ غبار سمجھے

تھے یہ تو ایک تیز وتند آندھی بن کر ہمارے اس پورے نظام‘ ہمارے مفادات اور اس پورے معاشرتی ڈھانچے اور vested interests کو خس وخاشاک کی طرح اڑا کر منتشر کر دے گی۔ یہیں سے وہ دَور شروع ہوا جسے سیرت کی کتابوں میں ’’تَعْذِیْب الْمُسْلِمِیْنَ‘‘ یعنی مسلمانوں کی ایذا رسانی اور بہیمانہ تشدد (Persecution) کا دَور کہا جاتا ہے۔ کفار کی طرف سے جب مسلمانوں پر شدید جسمانی تشدد کیا جانے لگا تو بعض مسلمانوں کو کچھ گھبراہٹ لاحق ہوئی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ عنکبوت میں بھر پور خطاب وارد ہوا۔ چنانچہ صبر ومصابرت کی بحث میں قرآن کا اوّلین مقام جو ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہے وہ سورۂ عنکبوت کے پہلے رکوع پر مشتمل ہے۔ اب اسی پر آئندہ گفتگو ہوگی۔ ان شاء اللہ!

اہل ایمان کے لئے
ابتلاء وامتحان سے گزرنا لازمی ہے!

سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعد:
اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿الٓمّٓ ۝۱ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ يُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا
يُفۡتَنُوۡنَ ۝۲ وَلَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلَيَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا
وَلَيَعۡلَمَنَّ الۡكٰذِبِيۡنَ ۝۳ اَمۡ حَسِبَ الَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ اَنۡ
يَّسۡبِقُوۡنَا ؕ سَآءَ مَا يَحۡكُمُوۡنَ ۝۴ مَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ
اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝۵ وَمَنۡ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفۡسِهٖ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۶ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَنُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَحۡسَنَ الَّذِىۡ كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝۷
وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ حُسۡنًا ؕ وَاِنۡ جَاهَدٰكَ لِتُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ
لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا ؕ اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ
تَعۡمَلُوۡنَ ۝۸ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدۡخِلَنَّهُمۡ فِى
الصّٰلِحِيۡنَ ۝۹ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوۡذِىَ فِى اللّٰهِ
جَعَلَ فِتۡنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكَ لَيَقُوۡلُنَّ اِنَّا
كُنَّا مَعَكُمۡ ؕ اَوَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَعۡلَمَ بِمَا فِىۡ صُدُوۡرِ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۱۰ وَلَيَعۡلَمَنَّ
اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَيَعۡلَمَنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ ۝۱۱ وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ

اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحَامِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۫ وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾ ...... صدق اللہ العظیم

ان آیات مبارکہ کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

''الم' کیا لوگوں نے یہ خیال کیا تھا کہ وہ محض یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہ جائے گا۔ درآنحالیکہ ہم نے آزمایا ہے اُن کو جو اِن سے پہلے تھے' پس اللہ ضرور ظاہر کرے گا سچے ایمان والوں کو اور انہیں بھی ظاہر کردے گا جو (اپنے دعوائے ایمان میں) جھوٹے ہیں۔ کیا برے عمل کرنے والوں کا یہ گمان ہے کہ وہ ہماری گرفت سے بچ نکلیں گے؟ بہت ہی بری رائے ہے جو انہوں نے قائم کی ہے۔ جو کوئی بھی اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہے اسے جان لینا چاہئے کہ اللہ کا مقرر کردہ وقت آکر رہے گا اور وہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ اور جو کوئی جہاد کرتا ہے تو وہ اپنی جان (کی بھلائی) کے لئے ہی جہاد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ہم لازماً دور کردیں گے ان سے ان کی برائیاں اور ہم لازماً انہیں ان کے اعمال کی بہترین جزا دیں گے۔ اور ہم نے انسان کو وصیت کی والدین سے بھلائی اور حسن سلوک کی۔ (لیکن) اگر وہ تجھ سے جھگڑیں (اور مجبور کریں) کہ تُو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے جس کے لئے تیرے پاس کوئی علم نہیں ہے تو ان کا کہا مت مان۔ میری ہی طرف تم سب کو لوٹنا ہے' پھر میں تمہیں جتلا دوں گا جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ہم ضرور داخل کریں گے انہیں صالحین میں۔ اور لوگوں میں سے کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے لیکن اللہ کی راہ میں جب انہیں تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو وہ لوگوں کی طرف سے ڈالی ہوئی اس آزمائش سے یوں گھبرا اٹھتے ہیں جیسے اللہ کے

---

(۱)

(۲)

عذاب سے گھبرانا چاہئے۔ اور اگر آ جائے مدد تیرے ربّ کی طرف سے تو وہ لازماً یہ کہیں گے کہ ہم بھی تمہارے ہی ساتھ تھے۔ تو کیا اللہ نہیں جانتا جو کچھ لوگوں کے سینوں میں چھپا ہے۔ اور اللہ تو لازماً ظاہر کر دے گا ان کو جو واقعتاً مؤمن ہیں اور واضح کر دے گا ان کو کہ جو حقیقتاً منافق ہیں۔ اور جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ کہتے ہیں ایمان والوں سے کہ ہماری پیروی کرتے رہو اور ہم تمہاری خطاؤں کا بوجھ اٹھا لیں گے۔ حالانکہ وہ نہیں ہیں اٹھانے والے ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی۔ یقیناً وہ جھوٹے ہیں۔ اور وہ لازماً اٹھائیں گے اپنے بوجھ بھی اور اپنے ان بوجھوں کے ساتھ کچھ مزید بوجھ بھی۔ اور ان سے لازماً باز پرس ہوگی قیامت کے دن اس جھوٹ کے بارے میں جو وہ باندھ رہے تھے۔''

یہ ہے ان آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ۔ ابتداء سے محسوس ہو رہا ہے کہ اندازِ کلام کچھ تیکھا ہے۔ اس کے پس منظر کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ ایک حدیث اس کی بڑی صحیح وضاحت کرتی ہے۔

پس منظر

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا' مکی دور کے ابتدائی تین چار سال ایسے تھے کہ جن میں سردارانِ قریش' جنہیں قرآن حکیم نے ''ائمہ کفر'' قرار دیا ہے' اس خیال میں رہے کہ ع ''چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی'' اور یہ کہ ہمارے اس نظام باطل کو کوئی حقیقی خطرہ درپیش نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس دعوت کو چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش کی' اس کے استہزاء اور تمسخر کا معاملہ کیا' لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ بات آگے بڑھ رہی ہے' ہمارے نوجوان اس دعوت کو قبول کر رہے ہیں' ہمارے غلاموں کے طبقے میں اس دعوت کا نفوذ ہو رہا ہے' تب وہ چونکے کہ ع ''نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے!'' ان حالات میں جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے وہ اپنی پوری قوّتِ مدافعت کو مجتمع کر کے حملہ آور ہوئے۔ اس حملے نے تشدد اور تعذیب (persecution) کی شکل اختیار کی۔ دو طبقات اس تشدد کا سب سے زیادہ نشانہ

---

(۱)

بنے۔ ایک غلاموں کا طبقہ، جن کا نہ تو کوئی پرسانِ حال ہی تھا اور نہ ہی ان کے کوئی حقوق تھے، وہ تو اپنے آقاؤں کی ایسی ملکیت تھے جیسے بھیڑ اور بکری، کہ جب چاہا اسے ذبح کر دیا اور جو چاہا ان کے ساتھ سلوک کیا۔ لہٰذا اس بہیمانہ تشدد کا سب سے زیادہ شکار وہی لوگ ہوئے جو غلاموں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ۔ اسی طرح آلِ یاسر جو اگرچہ غلام نہیں تھے لیکن باہر سے آ کر شہر میں آباد ہونے کی وجہ سے اجنبی تھے، کوئی ان کا پشت پناہ، حامی اور مددگار نہ تھا۔ اس لئے ابوجہل نے انہیں بدترین تشدد اور اپنے بہیمانہ انتقامی جذبات کا ہدف بنایا۔ چشمِ تصور سے دیکھئے اُمیہ بن خلف حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تپتی ہوئی پتھریلی زمین پر اوندھے منہ لٹا کر گھسیٹ رہا ہے، جبکہ سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو اور آگ اگل رہا ہو۔ پھر ان کے سینے پر ایک بھاری سل بھی رکھ دی جاتی تھی۔ یہ تھا وہ اذیت ناک سلوک جو ان غلاموں اور بے یار و مددگار لوگوں کے ساتھ اختیار کیا گیا۔ حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ پر تشدد کی جو حدیں توڑی گئیں اس کی ایک مثال اس واقعہ میں دیکھئے کہ ایک مرتبہ آگ جلائی گئی، دہکتے ہوئے انگارے زمین پر بچھا دیئے گئے اور حضرت خبابؓ کو ننگی پیٹھ ان انگاروں پر لٹا دیا گیا۔ کمر کی کھال جلی، چربی پگھلی اور اس سے بتدریج وہ انگارے سرد ہوئے!! تشدد کا یہ سلسلہ مسلسل تین چار سال تک اپنے پورے نقطۂ عروج پر رہا۔

اس دور کا ایک واقعہ حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ سناتے ہیں کہ جب یہ مصائب ہمارے لئے ناقابل برداشت ہو گئے تو ایک روز ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ اُس وقت کعبے کے سائے میں اپنی چادر کا ایک تکیہ سا بنائے ہوئے استراحت فرما رہے تھے۔ ہم نے جا کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کی مدد کب آئے گی (اب ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہونے کو ہے اور برداشت کی انتہا ہو گئی ہے)۔ حضرت خبابؓ فرماتے ہیں اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر بیٹھ گئے۔

---

(۱)

آپؐ کے چہرۂ مبارک پر قدرے ناراضگی کے آثار ظاہر ہوئے اور آپؐ نے فرمایا: ’’خدا کی قسم! تم سے پہلے لوگ اللہ کی راہ میں مصائب اور شدائد میں یہاں تک مبتلا کئے گئے کہ توحید کا علَم تھامنے کی پاداش میں ان میں سے کسی کو گڑھا کھود کر آدھے دھڑ تک گاڑ دیا جاتا اور پھر ایک آرا اس کے سر پر رکھ کر اسے چیرنا شروع کرتے یہاں تک کہ اس کا پورا جسم دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتا لیکن پھر بھی وہ لوگ توحید پر کاربند رہتے اور راہِ حق سے ہٹنے کا نام تک نہ لیتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوہے کی کنگھیوں سے لوگوں کے جسموں کو اس طرح مجروح کیا گیا کہ ان کی ہڈیوں پر سے گوشت کھرچ ڈالے گئے اور ایسا بھی ہوا کہ آگ کے الاؤ جلائے گئے اور ان میں زندہ انسانوں کو جھونک دیا گیا۔ تم پر تو ایسی کوئی مصیبت نہیں پڑی (تم لوگ جلدی مچا رہے ہو)۔ وہ وقت آکر رہے گا کہ ایک سوار صنعا سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسے سوائے اللہ کے اور کسی کا خوف نہ ہوگا‘‘۔

کسی قدر خفگی کا یہ انداز جو اس حدیث مبارکہ سے سامنے آتا ہے‘ وہی اسلوب یہاں سورۃ العنکبوت کی ابتداء میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ گویا ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

تم نے اسے پھولوں کی سیج سمجھا تھا حالانکہ یہ وہ راستہ ہے جس میں آزمائشوں کی خاردار جھاڑیاں قدم قدم پر موجود ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں اللہ کی جانب سے اظہارِ خفگی یقیناً موجود ہے تاہم یہ بات ذہن میں رکھئے کہ جیسے کسی استاد یا مربی کا اپنے زیر تربیت تلامذہ کے ساتھ ہمیشہ یہ معاملہ ہوتا ہے کہ کبھی وہ ڈانٹتا ہے تو کبھی دلجوئی بھی کرتا ہے‘ اور کبھی ہمت بڑھانے کے لئے شاباش بھی دی جاتی ہے اور کبھی زیر تربیت شخص کی طرف سے ذرا کم ہمتی کا مظاہرہ ہو یا اس سے کسی کمزوری یا تقصیر کا صدور ہو رہا ہو تو پھر زجر و توبیخ بھی ہوتی ہے‘ ڈانٹ ڈپٹ سے بھی کام لینا پڑتا ہے‘ اسی طرح اللہ جو

---

(۱)

سب کا حقیقی مربی ہے‘ وہ اپنے بندوں کے حق میں یہ دونوں صورتیں استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس ڈانٹ میں بھی ایک شفقت ہوتی ہے‘ وہ محبت سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ عتاب درحقیقت محبت آمیز ہوتا ہے۔ تربیت کے عمل میں یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ تربیت کا یہی اسلوب سورۂ عنکبوت کے اس پہلے رکوع میں بہت نمایاں ہے۔

آیات کی تشریح

اس رکوع کی پہلی آیت جو سورۂ عنکبوت کی بھی پہلی آیت ہے‘ حروفِ مقطعات پر مشتمل ہے۔ ان کا مفہوم و معنی کیا ہے؟ ہمارے اس منتخب نصاب میں چونکہ حروفِ مقطعات کا ذکر پہلی بار آ رہا ہے لہٰذا ان کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔ تاہم یہاں صرف اسی قدر سمجھ لیجئے کہ ان کے حتمی اور یقینی معنی کوئی نہیں جانتا۔ یہ ایک راز ہے‘ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مابین۔ کہنے والوں نے بہت کچھ کہا ہے‘ ان کے مفہوم کی تعیین میں عقل و خرد کے گھوڑے دوڑائے گئے ہیں‘ ظن و تخمین سے بھی بہت سی باتیں کہی گئیں لیکن حق بات یہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ہی ان کی اصل مراد سے واقف ہیں۔

اگلی آیت پر نظر کیجئے: ﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا......﴾ کہ کیا لوگوں نے یہ گمان کیا تھا کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں گے‘ انہیں چھٹکارا مل جائے گا‘ جہنم سے نجات حاصل ہو جائے گی اور جنت میں داخلہ ہو جائے گا‘ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے۔ یہاں یہ بات نوٹ کیجئے کہ مسلمانوں سے براہِ راست خطاب کی بجائے صیغہ غائب میں ان سے گفتگو ہو رہی ہے۔ یوں نہیں فرمایا کہ ''اے مسلمانو! کیا تم نے یہ سمجھا تھا......'' بلکہ فرمایا ''کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا......'' یہ اجنبیت اور غیریت کا انداز ہے جو درحقیقت خفگی اور ناراضگی کو واضح کرنے کے لئے بڑا ہی لطیف پیرایہ ہے۔

ذرا اس پس منظر میں اپنا جائزہ لیجئے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں! آج کے مسلمان کی سوچ کیا ہے؟ انہوں نے تو پھر بھی دعوتِ ایمان کو شعوری طور پر قبول کیا تھا۔ اگر ''اٰمَنَّا'' کہا تھا تو اپنے کچھ آبائی عقائد کو چھوڑ کر کہا تھا‘ ایک انقلابی قدم اٹھایا تھا۔ گویا ایک

طرح کا مجاہدہ اور ایثار کیا تھا اور ایک ہم ہیں کہ بس ایک متوارث مذہبی عقیدے کی بنیاد پر مسلمان ہیں، عمل کا خانہ بالکل خالی ہے، یقین قلبی کی دولت سے محروم اور عملی اعتبار سے دین و مذہب سے کوسوں دور، لیکن سمجھے یہ بیٹھے ہیں کہ ہم تو بخشے بخشائے ہیں، جنت ہمارا پیدائشی حق ہے، فوز و فلاح تو ہمیں ہی ملنی ہے۔ اس پس منظر میں ذرا اس آیۂ مبارکہ کو پڑھئے اور بار بار پڑھئے!

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ﴾

’’کیا لوگوں نے یہ گمان کیا تھا کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں گے محض یہ کہنے پر کہ ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہ جائے گا!‘‘

کیا ان کی جانچ پرکھ نہیں ہو گی، انہیں ٹھوک بجا کر نہیں دیکھا جائے گا کہ کتنے پانی میں ہیں، کیا واقعی ایمان ان کے دلوں میں جاگزیں ہو چکا ہے یا یہ صرف مُنہ کا پھاگ ہے جو کھیلا جا رہا ہے؟ فتنے کا لفظ اس سے پہلے سورۃ تغابن میں بھی آ چکا ہے: ﴿اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَ اَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ﴾ فتنہ عربی میں کسوٹی کو کہتے ہیں جس پر گھس کر کھرے اور کھوٹے کی پہچان کی جاتی ہے، جس پر سونے کو رگڑ کر یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ زرِ خالص ہے یا اس میں کھوٹ شامل ہے، اور اگر کھوٹ شامل ہے تو کتنا ہے۔ اللہ کی راہ میں یہ مشکلات و مصائب، یہ تکالیف و آلام، یہ ایذائیں اور یہ قربانیاں، یہ سب درحقیقت کسوٹی کے درجے میں ہیں جن پر تمہیں پرکھا جا رہا ہے۔ یہ تمہارے ایمان کا ٹیسٹ ہے، یہ سب تمہارے ایمان کی صداقت کا ثبوت فراہم کرنے کا ذریعہ ہیں!!

اللہ کی مستقل سنّت

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ﴾ کہ ہماری تو یہ سنت ثابتہ ہے، ہمارا تو یہ مستقل طریقہ اور قاعدہ رہا ہے کہ جس نے بھی ایمان کا دعویٰ کیا ہم نے اسے جانچا اور پرکھا، اسے امتحانات اور آزمائشوں سے دوچار کیا تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ اس طرح ہم نے کھرے کو کھوٹے سے ممیّز کیا اور سچے کو

(۱)

جھوٹے سے ممتاز کر دکھایا۔ ﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۝﴾ لفظی ترجمہ تو یہ ہوگا ''اللہ ان کو جان کر رہے گا جو سچے ہیں اور ان کو بھی جان کر رہے گا جو جھوٹے ہیں۔'' لیکن چونکہ علمِ الٰہی قدیم ہے' اللہ کو کسی چیز کے جاننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' وہ علم از خود اور وقوع سے پہلے اسے حاصل ہے لہٰذا یہاں اس سے مراد ہوگی کہ اللہ ظاہر کر دے گا' کھول دے گا' اصل حقیقت کو بے نقاب کر دے گا۔ یہاں نوٹ کیجئے کہ الفاظ ایسے لائے گئے ہیں کہ عربی زبان میں تاکید کے لئے اس سے اوپر اور کوئی اسلوب نہیں ہے۔ فعل مضارع سے قبل لام مفتوح اور اس کے آخر میں نون مشدد۔ ''لَيَعْلَمَنَّ'' یہ گویا تاکید کا آخری اور انتہائی انداز ہے جو عربی زبان میں مستعمل ہے۔ مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ ضرور واضح کرے گا' لازماً کھول کر رکھ دے گا کہ کون لوگ سچے ہیں اور کون جھوٹ موٹ کا دعوائے ایمان کر رہے ہیں۔ یہاں لفظ ''صَدَقُوْا'' کو بھی خاص طور پر نوٹ کیجئے۔ آیۂ بر بھی اسی پر ختم ہوئی تھی: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝﴾ اسی طرح سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کا اختتام بھی اسی لفظ پر ہوا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝﴾ گویا صادق القول اور مخلص مسلمانوں کو جھوٹے اور دغا باز مدعیانِ ایمان سے ممیّز و ممتاز کرنا درحقیقت آزمائش کا اصل مقصود ہے۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۴

یہ مضمون قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر آیا ہے اور اسی شان اور اسی گھن گرج کے ساتھ آیا ہے۔ اسی طرح کان کھول کر سنایا گیا ہے کہ ابتلاء اور آزمائش تو لازماً آئے گی۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۴ میں فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۝﴾

''اے مسلمانو! کیا تم نے یہ گمان کیا تھا کہ جنت میں (آسانی سے) داخل ہو جاؤ گے' حالانکہ ابھی تو تم پر وہ حالات وارد ہی نہیں ہوئے جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر آئے تھے۔ (حضرت خبابؓ بن الارت کے حوالے سے جو حدیث ابھی بیان ہوئی تھی' یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل اسی آیۂ مبارکہ کی ترجمانی ہے کہ وہ کٹھن مراحل اور بڑے بڑے امتحانات تو ابھی اس راہ میں تمہیں درپیش ہی نہیں ہوئے۔) ان پر فقر و فاقے کی سختیاں آئیں' اور بہت سی جسمانی تکالیف انہیں جھیلنی پڑیں اور وہ ہلا ڈالے گئے (جھنجھوڑ دیئے گئے)' یہاں تک کہ پکار اٹھے (چیخ اٹھے) وقت کے رسول اور ان کے ساتھی اہل ایمان کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اس وقت انہیں بتایا گیا کہ) آگاہ رہو' اللہ کی مدد قریب ہے۔''

یہ ہے امتحان و آزمائش کی وہ کسوٹی جس کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔

ایمان کی اس راہ میں قدم رکھو تو ذہنی طور پر تیار ہو کر آؤ کہ آزمائشوں اور امتحانات سے گزرنا ہو گا۔ تکالیف اور مصائب تو اس راہ کے سنگ میل ہیں اور یہ سب چیزیں اہل ایمان کو جانچنے اور مزید نکھارنے کا ذریعہ ہیں۔ بادِ مخالف کی تندی سے گھبرا اٹھنے کی بجائے اسے خوش آمدید کہنا چاہیئے کہ ع یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے۔

سورۂ آل عمران اور سورۂ توبہ کی آیات

یہی مضمون سورۂ آل عمران میں ان الفاظ میں وارد ہوا:

﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَلَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ جٰھَدُوۡا مِنۡکُمۡ وَیَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ۝﴾ (آل عمران:۱۴۲)

''کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر ہی نہیں کیا (جانچا ہی نہیں) کہ کون ہیں تم میں سے وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور کون ہیں جو صبر کا دامن تھامے رہتے ہیں۔''

سورۃ الحج کے الفاظ ﴿وَجَاهِدُوۡا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ﴾ ذہن میں لائیے۔ ''اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے''۔ اور اسی میں اہل ایمان کے

ایمان کی آزمائش مضمر ہے کہ کون ہیں جو اس کے نام پر اپنی جانوں کا ہدیہ پیش کرنے کو حقیقی کامیابی سمجھتے ہیں جیسے کہ ایک صحابی نے شہید ہوتے وقت کہا تھا: **فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ** ''ربِّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا''۔ سورۂ توبہ میں اس مضمون کو دیکھئے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۝﴾ (التوبۃ:١٦)

''کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ اللہ نے ابھی تو یہ دیکھا ہی نہیں کہ کون ہیں تم میں سے وہ لوگ کہ جو جہاد کا حق ادا کرتے ہیں اور جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول اور سچے مؤمنوں کے سوا کسی اور کو اپنا بھیدی نہیں بنایا (جو اللہ اور اس کے رسول کے لئے تمام دُنیوی تعلقات پر خط تنسیخ پھیر سکتے ہیں) اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔''

تو بالکل اسی انداز سے سورۂ عنکبوت شروع ہوئی:

﴿ الٓمّٓ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۝ ﴾

ابتلاء وآزمائش کی حکمت

اللہ کی راہ میں ابتلاء وآزمائش کی سب سے پہلی حکمت یہاں واضح کر دی گئی ہے کہ کسی بھی انقلابی جدوجہد کے لئے جو اس اہم کام کے لئے کھڑی ہو رہی ہو' یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تطہیر ہوتی رہے' وقتاً فوقتاً چھانٹی ہوتی رہے۔ صرف مذہبی سطح پر انسانوں کی بھیڑ جمع ہو تو وہاں چھانٹی کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اگر نصب العین انقلابی ہو' اقامت دین کی جدوجہد درپیش ہو' کسی غلط نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر نظامِ حق کو برپا کرنا اور غالب و نافذ کرنا مقصود ہو تو اس کے لئے جس قسم کی جماعت درکار ہوگی اس میں چھانٹی کا عمل ضروری ہوگا تاکہ کچے اور ناپختہ لوگ جھڑتے چلے جائیں اور صرف

پختہ کارسرفروش، کہ جو دین کی راہ میں تن من دھن نثار کرنے والے ہوں، اس جماعت کی ریڑھ کی ہڈی بن سکیں۔ اسی تطہیر کے عمل سے معلوم ہو گا کہ کون کتنے پانی میں ہے، کون واقعتاً اللہ کو ماننے والا اور آخرت کا یقین رکھنے والا ہے، کون واقعتاً اللہ اور اس کے رسول کو ہر معاملے میں مقدم رکھنے والا ہے، کون ہے جو اس ترازو پر پورا تل رہا ہے جو سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ کے حوالے سے آئی تھی کہ ''اے نبی! لوگوں سے کہہ دیجئے: اگر تمہیں اپنے باپ اور اپنے بھائی اور اپنے بیٹے اور اپنی بیویاں اور اپنے رشتہ دار اور اپنے وہ مال جو تم نے جمع کیے ہیں اور اپنے وہ کاروبار جو بڑی محنت سے جمائے ہیں اور جن میں اب مندے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور اپنے وہ مکان جو تمہیں بہت محبوب ہیں، اگر یہ سب محبوب تر ہیں اللہ سے اور اللہ کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد سے تو جاؤ، انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے، اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

یہ چھانٹ، یہ تمیز اور یہ تطہیر کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے، یہی اصل غرض و غایت ہے ان ابتلاؤں اور آزمائشوں کی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ مختار مطلق ہے، اس کے اذن کے بغیر ایک پتا تک جنبش نہیں کرتا، ابوجہل کی کیا مجال کہ وہ آلِ یاسرؓ کو ستا سکے! اُمیہ بن خلف کی کیا جرأت کہ وہ اللہ کے ایک سچے پرستار، ایک مؤحد بندے بلالؓ کو اس طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر سکے!!...... یہ جو کچھ ہوا اذنِ ربّ سے ہوا۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ ان کٹھالیوں میں سے گزار کر تمہیں زرِ خالص بنانا چاہتا ہے۔ تمہاری تربیت، تمہاری پختگی، تمہارے ایمان کا ثبوت، تمہارے اندر عزم اور ہمت اور ولولے کو اوجِ کمال تک پہنچانا یہ وہ غرض اور مقصد ہے جس کے تحت یہ مصیبتیں، ایذائیں، تکالیف، ابتلائیں اور آزمائشیں اہلِ ایمان کو درپیش ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ راہِ حق میں استقامت عطا فرمائے۔

مسلمانوں کے لئے تسلّی و تشفی کے کلمات

(۱)

ان دو آیات میں اس گھبراہٹ پر کہ جو بعض مسلمانوں کی طرف سے اللہ کی راہ میں ایذاؤں' تکلیفوں اور مصیبتوں کے ضمن میں ظاہر ہوئی تھی' اللہ کی جانب سے کسی قدر خفگی کا اظہار نمایاں تھا۔ لیکن اب اگلی آیت میں ان کی تسلّی' دلجوئی اور تشفی کے ضمن میں ان کفار و مشرکین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو انہیں ستا رہے تھے اور جن کے ہاتھوں انہیں ایذائیں پہنچ رہی تھیں' فرمایا جا رہا ہے کہ کیا ان بدبختوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہماری پکڑ سے بچ نکلیں گے! ابوجہل نے جو حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو برچھا مار کر شہید کیا اور اس نے حضرت یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو اس طور سے شہید کیا کہ چار مضبوط و توانا سانڈ اونٹ لے کر' ان چاروں سے رسے باندھ کر' ان میں سے ایک رسے سے حضرت یاسرؓ کا ایک بازو' دوسرے سے دوسرا بازو' تیسرے سے آپؓ کی ایک ٹانگ اور چوتھے سے دوسری ٹانگ باندھی گئی اور پھر ان چاروں اونٹوں کو جو دوڑایا گیا تو حضرت یاسرؓ کے جسم کے پرخچے اڑ گئے' اُمیہ بن خلف جو حضرت بلالؓ کو ستا رہا تھا اور حضرت خبابؓ بن ارت کو جو ایذائیں دی جا رہی تھیں' یہ آیۂ مبارکہ ان کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَاؕ سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ۝﴾

''کیا ان لوگوں نے جو اِن برائیوں میں مبتلا ہیں (کہ ہمارے چاہنے والوں کو ستا رہے ہیں) یہ گمان کیا ہے کہ ہماری پکڑ سے بچ نکلیں گے؟ بڑی بری رائے ہے جو وہ قائم کرتے ہیں۔''

اس میں دراصل کفار و مشرکین سے تخاطب نہیں ہے۔ بات ان سے کہنی مقصود ہی نہیں ہے' بلکہ درحقیقت یہ مسلمانوں کو سنایا جا رہا ہے اور اس طرح ان کے زخمی دلوں پر گویا ہمدردی کا پھاہا رکھا جا رہا ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ تمہیں ایذائیں دینے والے یہ مشرکین ہماری گرفت سے بچ نکلیں گے' یہ تو ہماری حکمت کے تحت ہے کہ ہم نے ان مشرکین کی رسی دراز کی ہوئی ہے۔ اس ذریعے سے دراصل تمہاری آزمائش مقصود ہے۔ تمہیں ان آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزار کر کندن بنانا ہے۔ اسی لئے ابھی ہم نے انہیں ڈھیل

دے رکھی ہے۔ لیکن اگر وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہماری پکڑ سے بچ نکلیں گے تو وہ بڑے مغالطے میں ہیں۔ تم مطمئن رہو' ان میں سے ہر ایک کو اپنے کیے کی بھرپور سزا مل کر رہے گی۔ اگلی آیت میں مزید تسلّی اور دلجوئی کے لئے فرمایا:

﴿مَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ﴾

کہ جو کوئی اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہے تو وہ جان لے کہ اللہ کا معین کردہ وہ وقت آ کر رہے گا۔ اشارہ اہل ایمان کی طرف ہے کہ تم یہ سب تکالیف جھیل رہے ہو اللہ سے ملاقات کی اُمید میں' اس اُمید میں کہ ایک دن آئے گا کہ اپنے پروردگار سے کہ جو تمہارا مطلوب ومقصود ہے اور جس کی خاطر تم یہ تکالیف اٹھا رہے ہو' تمہاری ملاقات ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہارے دل میں یہ وسوسہ پیدا کر دے کہ کیا خبر وہ دن آئے گا بھی کہ نہیں! ...... مطمئن رہو' اللہ کا وہ مقرر کیا ہوا وقت آ کر رہے گا۔ وہ گھڑی اٹل اور شدنی ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ کسی وسوسے کو ذہن کے قریب مت پھٹکنے دو' تمہارا اجر محفوظ ہے۔ اور جان لو ﴿وَھُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ﴾ کہ جس کے لئے تم یہ سب کچھ جھیل رہے ہو وہ کوئی بے خبر ہستی نہیں ہے' وہ معاملہ نہیں ہے کہ مر گئے ہم انہیں خبر نہ ہوئی' وہ سمیع (سب کچھ سننے والا) اور علیم (سب کچھ جاننے والا) ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی نگاہوں میں ہے۔ بلالؓ کی زبان سے نکلنے والا کلمۂ توحید' اس حال میں کہ پیاس کی شدت سے زبان باہر نکلی ہوئی ہے' دھوپ کی تمازت کی وجہ سے جان لبوں پر آئی ہوئی ہے' لیکن کلمۂ توحید ہی نکل رہا ہے اَحد' اَحد' کہ میں تو ایک اللہ ہی کا ماننے والا ہوں' اسی کا پرستار ہوں' اس کے سوا کسی اور کو معبود ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ان کی زبان سے نکلنے والا یہ کلمہ اللہ سن رہا ہے۔ ھُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ تمہارے دلوں سے جو صدائیں نکل رہی ہیں ان کا بھی جاننے والا ہے۔ تو پہلی دو آیات میں کسی قدر زجر' جھڑکی اور خفگی کا اظہار تھا اور اس کے بعد دو ہی آیات میں صحابہ کرامؓ کے لئے تسلّی' تشفی اور دلجوئی کا انداز اختیار کیا گیا۔

جہاد' اللہ پر احسان نہیں ہے!

اگلی آیت میں سختی کا رنگ پھر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ کان کھول دینے کے انداز میں فرمایا:

﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ﴾

کہ کوئی جہاد کرتا ہے تو وہ جان لے کہ وہ اپنے ہی بھلے کو جہاد کرتا ہے۔ یہ خیال ہرگز دل میں نہ آئے کہ وہ اللہ پر کوئی احسان کر رہا ہے‘ اس جدوجہد اور ایثار وقربانی کا تمام تر فائدہ خود اسی کو پہنچے گا۔

یہاں ’’جہاد‘‘ کا لفظ خصوصی طور پر توجہ کے لائق ہے۔ اس لئے کہ یہ سورت بالاتفاق مکّی ہے اور اس کا زمانۂ نزول سن پانچ یا چھ نبوی بنتا ہے۔ ہجرتِ حبشہ کے موقع پر یہ سورۂ مبارکہ نازل ہوئی‘ بلکہ ہجرت کی طرف اشارہ اور رہنمائی اسی سورۃ میں موجود ہے۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد کا ذکر نہایت اہتمام کے ساتھ آیا ہے: ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ﴾ حالانکہ قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ تو ابھی آٹھ نو برس کے بعد آنے والا تھا۔ یہ کشمکش اور یہ جدوجہد اس وقت Passive Resistance (صبرِ محض) کے دور میں تھی۔ مسلمانوں کو حکم تھا کہ ڈٹے رہو‘ قائم رہو‘ ماریں کھاؤ لیکن مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ اس کے باوجود اس صورت حال کو جہاد کا نام دیا گیا۔ یہ جدوجہد اور یہ Struggle ہے اپنے مسلک اور اپنے ایمان کے لئے‘ اپنے عقائد اور اپنے نظریات کے لئے۔ ثابت کر دو کہ تم ثابت قدم ہو اور اس کے لئے ہر شے کو قربان کر سکتے ہو‘ ہر بازی کھیل سکتے ہو‘ لیکن کبھی بھولے سے بھی دل میں یہ خیال نہ آئے کہ تم اللہ پر‘ اس کے دین پر یا اس کے نبی ﷺ پر کوئی احسان کر رہے ہو۔ اللہ تو بے نیاز ہے‘ اللہ کو کوئی احتیاج نہیں‘ وہ غنی ہے تمام جہانوں سے۔

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ تمہارے اس جہاد و مجاہدہ‘ صبر و مصابرت اور ایثار و قربانی کا سارا نفع تمہی کو پہنچنے والا ہے ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ﴾۔ چنانچہ اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ تمہاری سیرت پختہ ہو گی‘ تمہارا کردار کندن بنے گا بلکہ تمہارے ایمان وعمل کو جلا حاصل ہو گی‘ آخرت میں تمہیں اس

کی بدولت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سایہ اور جنت کی نعمتیں نصیب ہوں گی۔ لہٰذا اللہ کی راہ میں جہاد و مجاہدہ اس خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے کرو کہ یہ میں اپنا کام کر رہا ہوں، اللہ پر اور اس کے نبی ﷺ پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔ یہ مضمون یہاں بڑے تیکھے انداز میں آیا ہے: ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ کہ جو کوئی جہاد کرتا ہے، دین کی راہ میں سرفروشی کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ اپنے ہی فائدے کے لئے یہ سب کچھ کرتا ہے، اللہ کو کسی کی کوئی احتیاج نہیں ہے، وہ تمام جہانوں سے غنی اور بے نیاز ہے۔ اسی مضمون کا دوسرا رخ اس سے قبل سورۃ الحجرات میں ہمارے زیرِ مطالعہ آیا تھا:

﴿يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ ۖ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾

''(اے نبیؐ) یہ آپ پر احسان دھر رہے ہیں اپنے اسلام کا۔ فرما دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا کوئی احسان نہ دھرو، بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی راہ سجھائی اگر تم سچے ہو!''

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی

منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

کہ بادشاہ کی خدمت کا تمہیں اگر کوئی موقع ملا ہے تو یہ نہ سمجھو کہ اس پر تمہارا کوئی احسان ہے بلکہ بادشاہ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقع دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے بھی اللہ نے اپنے دین کی خدمت کی توفیق دی ہے اسے اللہ کا احسان مند ہونا چاہئے کہ اس نے اسے اپنی خدمت کے لئے قبول فرما لیا ہے۔

اطمینانِ قلب کے لئے ایک عظیم بشارت

اگلی آیت میں ایک بار پھر ہمت بندھانے کا انداز ہے۔ چنانچہ اہل ایمان کی تسلی، تشفی اور قلبی اطمینان کے لئے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ

اَحۡسَنَ الَّذِیۡ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ۝﴾

کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ان سے ہمارا پختہ وعدہ ہے کہ ہم لازماً ان سے ان کی برائیوں کو دور کر دیں گے اور ہم لازماً ان کے اعمال کا بہترین بدلہ انہیں عطا کریں گے۔

نوٹ فرما لیجئے کہ یہاں ایمان کے ساتھ ''عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' اسی طرح جڑا ہوا آ رہا ہے جیسے کہ ہمارے پہلے سبق یعنی سورۃ العصر میں تھا: ﴿وَالۡعَصۡرِ۝ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ۝ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾......اگر ایمان ہے اور عمل صالح نہیں ہے' بلکہ ایمان کا بھی صرف اقرار باللسان والا پہلو ہو یعنی صرف قانونی ایمان موجود ہو تو اس کا فائدہ بس اتنا ہی ہوگا کہ دنیا میں مسلمان سمجھ لئے جاؤ گے لیکن اللہ کے ہاں کسی کا واقعتاً مؤمن قرار پانا کچھ اور شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ ہاں وہ ایمان اگر یقین بن کر دل میں جاگزیں ہو گیا ہو اور اس کے عملی تقاضے انسان پورے کر رہا ہو تب اللہ کا پختہ وعدہ ہے کہ: ﴿لَنُکَفِّرَنَّ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَلَنَجۡزِیَنَّہُمۡ اَحۡسَنَ الَّذِیۡ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ۝﴾ انتہائی تاکیدی انداز ہے کہ ایسے لوگوں سے ہم ان کی برائیوں کو لازماً دور کر دیں گے اور ان کی محنت و کاوش کا بھرپور صلہ انہیں عطا فرمائیں گے۔

یہ مضمون تقریباً انہی الفاظ میں سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی آیات میں بھی آ چکا ہے:

﴿فَالَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا وَاُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ وَاُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَقٰتَلُوۡا وَقُتِلُوۡا لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ج﴾

''پس وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور وہ اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور انہیں میری راہ میں تکالیف پہنچائی گئیں اور انہوں نے قتال کیا اور جان قربان کر دی' میں لازماً دور کر دوں گا ان سے ان کی برائیوں کو۔ (ان کے نامۂ اعمال کے دھبے بھی دھو دوں گا اور ان کے دامن کردار کے داغ بھی صاف کر دوں گا) اور میں انہیں لازماً داخل کروں گا ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔''

(جاری ہے)

نوجوانوں کا خصوصی معاملہ

مکّہ میں نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے والوں پر جو بدترین تشدّد ڈھورہا تھا اس کا اوّلین نشانہ تو وہ لوگ بنے جو غلاموں کے طبقے سے ایمان لائے تھے لیکن اس تشدّد کا دوسرا بڑا شکار نوجوان تھے۔ یہ بات یہاں سمجھ لینی چاہئے کہ ہر دور میں کسی بھی انقلابی دعوت کی طرف پیش قدمی کرنے والوں میں معاشرے کے یہی دو طبقے آگے بڑھتے ہیں۔ یا تو معاشرے کے مظلوم اور پسے ہوئے طبقات کسی انقلابی دعوت کو لپک کر قبول کرتے ہیں اور یا پھر نوجوان اس میں پیش قدمی کرتے ہیں۔ اسلام کی دعوت اپنی اصل کے اعتبار سے' اپنی نوعیت کے اعتبار سے انقلابی دعوت ہے۔ اسلام کی دعوت' عام مذہبی معنی میں تبلیغ کا عمل نہیں ہے۔ یہ بدھ مت کے بھکشوؤں یا عیسائی مشنریوں کی طرح کی تبلیغ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی دعوت ہے جس کی پشت پر ایک مضبوط نظریہ ہے۔ اس نظریئے کی بنیاد پر ایک انقلاب برپا کرنا ہے' نظام تبدیل کرنا ہے' اللہ کے دین کو سربلند کرنا ہے' اس کی کبریائی کو نافذ و قائم کرنا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے' ایک نہایت گھمبیر انقلابی جدوجہد ہمیں نبی اکرم ﷺ کی اس تئیس سالہ جدوجہد میں نظر آتی ہے جس کا آغاز پہلی وحی کے نزول کے ساتھ ہوا اور جو آپؐ کے وصال تک جاری رہی۔ انقلابی دعوت کے بارے میں یہ سمجھ لیجئے کہ اگرچہ اس کا رُخ سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات کی طرف ہوتا ہے اور وہ پس ماندہ طبقات کو اپنا اوّلین ہدف نہیں بنایا کرتی' جیسے کہ عیسائی مبشرین یا مبلغین کا عام انداز ہوتا ہے کہ پسے ہوئے اور دبے ہوئے طبقات کی دلجوئی کرکے اور کچھ ان کی خدمت کرکے' مثلاً کچھ دودھ کے ڈبے تقسیم کرکے یا ان کے علاج معالجے کا بندوبست کرکے ان کے دلوں میں اپنے لئے ایک نرم گوشہ پیدا کرلیا جائے' تاہم اس انقلابی دعوت کی طرف سب سے پہلے یہی طبقات پیش قدمی کرتے ہیں۔

انقلابی دعوت ہمیشہ ایک فکر' ایک نظریہ پیش کرتی ہے اور اسے اس کی Face

Value پر قبول کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ چنانچہ انبیاء اور رسولوں کی دعوت کا انداز ہمیشہ یہ رہا کہ وہ سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات کو سب سے پہلے مخاطب کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تو حکم ہوا: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ ''جاؤ فرعون کے پاس وہ بہت سرکشی دکھاتا ہے''۔ گویا پہلا تبلیغی مشن جو انہیں سونپا گیا وہ فرعون کے دربار میں دعوت پیش کرنے کے حکم پر مشتمل تھا۔ نبی اکرم ﷺ کو اُم القریٰ یعنی مَکّہ میں جو بستیوں کا مرکز تھا' مبعوث کیا گیا۔ مَکّہ پورے عرب کے لئے تہذیبی' مذہبی اور ثقافتی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سیاسی صدر مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپؐ جب مَکّہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے تو وہاں آپؐ نے گلیوں میں کھڑے ہو کر اسلام کی صدا نہیں لگائی' دعوت وتبلیغ کے لئے پس ماندہ طبقات کو منتخب نہیں کیا بلکہ آپؐ نے طائف کے تین چوٹی کے سرداروں سے ملاقات کی اور اسلام کی دعوت ان کے سامنے رکھی! یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ دعوت اسلامی کا مزاج عام مذہبی تبلیغ سے بالکل جدا ہے' لیکن اپنی جگہ یہ بھی حقیقت ہے کہ جو سوسائٹی کے اعلیٰ طبقات ہوتے ہیں ان کے Vested Interests ہوتے ہیں' پہلے سے موجود نظام کے ساتھ ان کے بھاری مفادات وابستہ ہوتے ہیں' مصلحتوں کی بڑی بھاری بیڑیاں ان کے پاؤں میں پڑی ہوتی ہیں۔ ان کے لئے کسی انقلابی دعوت کو قبول کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تاہم ان میں بعض اوقات کچھ ایسے انتہائی سلیم الفطرت لوگ بھی ہوتے ہیں جو فوراً اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن عام طور پر جو لوگ اس دعوت کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں ان میں ایک تو وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اس معاشرے میں ویسے ہی دبے ہوئے اور پسے ہوئے ہوتے ہیں' جن کے کوئی مفادات اس نظام کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتے کہ جو ان کے پاؤں کی بیڑیاں بن سکیں یا ان کی آنکھوں کے آگے پردہ بن کر حائل ہو سکیں' وہ اس دعوت کو Face Value پر آگے بڑھ کر قبول کرتے ہیں۔ (اس طبقے میں سے حضرت بلالؓ اور حضرت خبابؓ بن الارت کا ذکر ہو چکا ہے)۔

دوسرا طبقہ جو کسی بھی انقلابی دعوت کی طرف پیش قدمی کرتا ہے وہ نوجوانوں کا طبقہ ہوتا ہے' اس لئے کہ یہ عمر ولولوں اور امنگوں کی عمر ہوتی ہے۔ ابھی کوئی مصلحت کوشی اور مصلحت بینی ان پر مسلّط نہیں ہوئی ہوتی۔ ان کے جسم و جان میں کردار کی حرارت موجود ہوتی ہے۔ ابھی ان کا ضمیر مفادات کے مقابلے میں اتنا شکست خوردہ نہیں ہوتا کہ کسی بات کو حق سمجھنے کے باوجود اسے رد کر دے۔ چنانچہ نوجوان ہی کسی انقلابی دعوت کا ہراول دستہ بنتے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر بھی ایمان لانے میں قریش کے سربرآوردہ اور شرفاء کے خاندانوں میں سے نوجوانوں ہی نے پیش قدمی کی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جب ایمان لائے تو ابھی نوعمر یعنی teen ager تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے جب ایمان قبول کیا تو وہ بھی عمر کے اسی دور سے گزر رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نوعمری میں اللہ نے جو امتیاز بخشا اس سے کون واقف نہیں! بلکہ ان کے بارے میں یوں کہیئے کہ وہ تو پہلے ہی اپنے تھے' گھر کے فرد تھے۔ اسی طرح نوجوانوں میں سے کئی ایسے تھے جو ایمان لائے۔ ان نوجوانوں پر بھی تشدّد ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو بنواُمیہ کے بڑے اعلیٰ گھرانے کے چشم و چراغ تھے' اگر چہ اتنے کم عمر نہیں تھے کہ انہیں teen ager قرار دیا جا سکے' لیکن ایمان لانے پر چچا نے یہ معاملہ کیا کہ ایک چٹائی میں لپیٹ کر انہیں دھواں دے دیا کہ دم گھٹ جائے۔ ان نوجوانوں کو اس جسمانی ایذاء اور تشدّد پر مستزاد جو مسئلہ درپیش ہوا وہ یہ کہ ان کے والدین اپنے حقوق کا واسطہ دے کر ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ اس نئے دین کو چھوڑو اور آبائی دین پر واپس آ جاؤ۔

ظاہر بات ہے کہ نوجوانوں کے طبقے (teen agers) میں سے جن لوگوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا ان کے بارے میں بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ انتہائی سلیم الطبع اور سلیم الفطرت نوجوان ہوں گے۔ ان کی سلامتیٔ طبع اور سلامتیٔ فطرت ہی کا یہ بھی تقاضا تھا کہ وہ اپنے والدین کا ادب واحترام ملحوظ رکھیں اور ان کے حقوق ادا کریں۔ لہٰذا ان کے لئے یہ ایک نہایت پریشان کن مرحلہ تھا کہ وہ

والدین کی اطاعت کریں اوران کا کہا مانیں یا توحید کواختیار کریں اور والدین کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کردیں۔ ادھران کے والدین اپنے حقوق کا واسطہ دے کرانہیں راہِ حق سے برگشتہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا واقعہ

اس سلسلے میں ایک بڑا عجیب معاملہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت سعدؓ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں اورانہی کے ہاتھوں بعد میں ایران فتح ہوا۔ یہ جب ایمان لائے تو ابھی نوعمر نوجوان تھے۔ والدفوت ہو چکے تھے' ماں نے بڑی محبت سے پالا اور بڑی محنت سے ان کی تربیت کی تھی۔ ماں اگر انتہائی محبت کرنے والی تھی تو بیٹا بھی سعادت مندی میں کم نہ تھا۔ ان کے سعادت منداور سلیم الطبع ہونے کا ایک مظہر یہ بھی سامنے آیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے۔ مشرک ماں نے اب اپنا پوراوزن ایک پلڑے میں ڈالا اور بیٹے پر دباؤ ڈالنے کے لئے یہ اعلان کر دیا کہ اگر سعد اپنے آبائی دین میں واپس نہ آیا تو نہ کچھ کھاؤں گی اور نہ پیوں گی' اپنے آپ کو ہلاک کرلوں گی۔ گویا آج کی اصطلاح میں ہم یوں کہیں گے کہ اس نے بھوک ہڑتال کر دی۔ آپ غور کیجئے کہ کیسی شدید ذہنی اذیّت اور سخت آزمائش سے حضرت سعدؓ اس وقت دوچار ہوئے ہوں گے۔ یہ ہے پس منظر جس میں یہ موضوع یہاں زیرِ بحث آرہا ہے۔

مسئلے کا حل

فرمایا: ﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ...... ﴾ کہ اے نوجوانو' تمہاری فطرت کا یہ اقتضاء غلط نہیں ہے کہ والدین کا ادب ولحاظ ہونا چاہئے' یہ چیز ہم نے خود فطرتِ انسانی میں ودیعت کی ہے۔ ہم ہی نے تاکید کی ہے انسان کو کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے' ان کا ادب و احترام کرے اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرے۔ یہ مضمون اس منتخب نصاب میں اس سے قبل سورۂ لقمان کے

دوسرے رکوع میں آ چکا ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ قرآن مجید میں مضامین کا تکرار و اعادہ کے ساتھ آنا بغیر کسی حکمت کے نہیں ہوتا۔ وہاں سورۂ لقمان میں حقوق کے حوالے سے گفتگو ہو رہی تھی کہ انسان پر سب سے پہلا اور سب سے مقدم حق اللہ کا ہے ﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ﴾ اس کے بعد والدین کا نمبر آتا ہے۔ گویا اللہ کے بعد سب سے بڑا حق انسان پر اپنے والدین کا ہے۔ تو وہاں یہ بحث اس حوالے سے آئی تھی کہ اگر کسی معاملے میں اللہ کا حق اور والدین کے حقوق ٹکرانے لگیں تو صحیح قابل عمل صورت کیا ہو گی!...... یہاں سورۃ العنکبوت میں معاملہ زیرِ بحث ہے کہ ایمان لانے والوں کو کن کن مسائل اور کون کون سے مخمصوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ نوجوانوں کے لئے چونکہ بالخصوص یہ مسئلہ خصوصی اہمیت کا حامل تھا کہ ان کے والدین انہیں شرک کرنے پر مجبور کرتے تھے لہٰذا اس مضمون کا یہاں پھر اعادہ کر دیا گیا۔ فرمایا:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾

یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے لیکن ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے۔ ہر صاحبِ حق پر کوئی اور صاحبِ حق موجود ہے' اور تمام حقوق میں فائق ترین حق اللہ کا ہے۔ والدین کا حق مسلّم' لیکن ''اگر وہ تم سے جھگڑیں (اور مجبور کریں) اس بات پر کہ تم میرے ساتھ کسی ایسی ہستی کو شریک ٹھہراؤ جس کے بارے میں تمہیں کوئی علم حاصل نہیں' تو ان دونوں کا کہا مت مانو!''

یہاں نوٹ کیجئے کہ لفظ جہاد مشرک والدین کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ ان کی یہ کوشش یعنی شرک کے حق میں اپنا دباؤ استعمال کرنا' یہ سب ان کا مجاہدہ ہے اور اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجاہدہ فی سبیل الشرک ہے' یا یوں کہئے کہ فی سبیل الطاغوت یا فی سبیل الشیطان ہے!...... تو اگر تمہارے والدین تمہیں شرک پر مجبور کر رہے ہیں تو درحقیقت وہ اپنے حقوق سے تجاوز کر رہے ہیں' لہٰذا ان کا کہنا مت مانو!...... مزید فرمایا:

﴿اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝﴾

''میری ہی طرف تم سب کو لوٹنا ہے اور پھر میں تمہیں جتلا دوں گا (کھول کھول

کر سامنے رکھ دوں گا) جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔''

معلوم ہوا کہ ایک تو اس طرح اس نہایت اہم مسئلے کا حل اللہ تعالیٰ نے پیش فرما دیا جو اہل ایمان میں سے نوجوان طبقہ کو درپیش تھا اور اس طرح ان کی ذہنی الجھن دور ہوئی۔

اہلِ ایمان کے لئے ایک نوید

اگلی آیت میں اہلِ ایمان کے لئے پھر reassurance ہے۔ یعنی تسلی و تشفی کا انداز اور اچھّے انجام کی نوید ہے۔ یہاں ہمیں اس معاملے پر بھی خاص طور پر غور کرنا ہو گا کہ یہ اعادہ کیوں ہو رہا ہے' حالانکہ دو آیات قبل اس سے ملتا جلتا مضمون گزر چکا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ۝﴾

''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہم انہیں لازماً نیکوکاروں میں داخل کریں گے۔''

دیکھئے' ایمان کے ساتھ اس کے عملی تقاضے یعنی عمل صالح کا ذکر ایک بار پھر اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس سیاقِ کلام اور جس context (پس منظر) میں گفتگو ہو رہی ہے' اس میں ''عمل صالح'' سے کون سے اعمال مراد ہیں؟ ابھی نماز تو فرض نہیں ہوئی' روزے کا کوئی حکم ابھی آیا ہی نہیں' زکوٰۃ کا ابھی کوئی نظام سرے سے قائم نہیں ہوا' تو یہاں ''عمل صالح'' سے آخر کون سا عمل مراد ہے! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ایمان کا جو بھی عملی تقاضا سامنے آئے اسے پورا کرنا' ایمان پر ثابت قدمی دکھانا' رسول اللہ ﷺ کے حکم کی اطاعت کرنا کہ رسولؐ اگر یہ کہیں کہ خواہ تمہیں اذیت دے کر ہلاک کر دیا جائے تم مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے' جماعتی ڈسپلن کی پابندی کرنا اور دین کی دعوت و تبلیغ میں نبی ﷺ کے دست و بازو بننا' یہ سب چیزیں عمل صالح میں شامل ہیں۔ گویا ایک لفظ میں اگر ہم یوں کہیں کہ یہاں ''عمل صالح'' سے مراد ایمان کے عملی تقاضوں کی ادائیگی ہے تو یہ درست ہو گا۔ اس لئے کہ ہمارے ذہنوں میں عمل صالح کا جو نقشہ بنا ہوا ہے اس کا

ابتدائی مکی دور میں وجود نہیں تھا! اس آیت میں ﴿لَنُدۡخِلَنَّهُمۡ فِی الصّٰلِحِیۡنَ﴾ کے الفاظ بھی خصوصی طور پر لائق توجہ ہیں: ''ہم لازماً انہیں صالحین میں داخل کر دیں گے''۔ وہی تاکیدی انداز جو آیت ۷ میں اختیار فرمایا گیا' یہاں بھی موجود ہے۔ اس آیت کا ابھی ہم نے مطالعہ کیا ہے:

﴿وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُکَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَیِّاٰتِهِمۡ وَلَنَجۡزِیَنَّهُمۡ اَحۡسَنَ الَّذِیۡ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ۝﴾

غور طلب بات یہ ہے کہ دوبارہ اس مضمون کا اعادہ کیوں ہوا! ذرا غور کریں گے تو بات واضح ہو جائے گی اور اس تکرار میں جو معنوی حسن ہے وہ سامنے آ جائے گا۔ دیکھئے' یہاں ان نوجوانوں کا معاملہ زیرِ بحث تھا جو اسلام لانے کی پاداش میں اپنے والدین سے کٹ رہے تھے' جنہیں اپنے رشتہ داروں سے تعلق کاٹنا پڑ رہا تھا۔ یہاں ان کے زخمی دلوں پر مرہم رکھا جا رہا ہے کہ تم صرف کٹے ہی نہیں ہو' کسی سے جڑے بھی ہو!...... تمہیں اس بات پر خوش ہونا چاہئے کہ اب تمہارا تعلق قائم ہوا ہے محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ کے ساتھ! تم ان صالحین اور نیکوکاروں کے ساتھ ایمانی رشتے میں منسلک ہو گئے ہو۔ چنانچہ وہ صدمہ جو ایک سلیم الطبع انسان محسوس کرتا ہے کہ میں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے کٹ گیا ہوں' اس کا ازالہ اس آیت سے ہو جاتا ہے۔

یہ ایک دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ ابوجہل نے عین میدانِ بدر میں جو دعا مانگی تھی تو اس میں تعلقات کے انقطاع ہی کی دہائی دی تھی۔ وہ دعا اس اعتبار سے بھی بڑی عجیب ہے کہ اس نے وہاں کسی لات' عزیٰ' ہبل یا کسی منات کو نہیں پکارا بلکہ صرف اللہ کو پکارا: ''اَللّٰهُمَّ اَقۡطَعَنَا لِلرَّحِمِ فَاَهِنۡهُ الۡیَوۡمَ'' اے اللہ جس شخص نے ہمارے رحمی رشتے کاٹ دیئے اسے آج رسوا کر دے!'' وہ دہائی دے رہا تھا محمد رسول اللہ ﷺ کے خلاف اور اس کے نزدیک آنحضور ﷺ کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ آپؐ نے باپ کو بیٹے سے جدا کر دیا' بھائی کو بھائی سے علیحدہ کر دیا' بیویوں اور شوہروں میں جدائی ڈال دی۔ اور اس طرح قریش کی قبائلی جمعیت منتشر ہو کر رہ گئی' ان کا شیرازہ پراگندہ

ہو کر رہ گیا۔ یہ ہے وہ معاملہ جس کے لئے ان نوجوانوں کے دلوں پر مرہم رکھا جا رہا ہے۔تم اگر اپنے عزیز رشتہ داروں سے کٹے ہو تو سوچو کہ نبی اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ سے جڑے بھی ہو! تمہیں ان لوگوں کی رفاقت نصیب ہوئی ہے جنہیں سورۃ الفاتحہ میں ''مُنْعَمْ عَلَیْھِمْ'' قرار دیا گیا____ اور مُنْعَمْ عَلَیْھِمْ کون ہیں' اس کا جواب سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں ہے:

﴿وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا﴾

کہ اپنے آباء واجداد سے اگر تم کٹ گئے' اپنے بھائی بندوں سے تمہارا تعلق منقطع ہو گیا تو ملول و غمگین نہ ہو' تمہیں ان لوگوں کی رفاقت نصیب ہوگئی ہے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے' روزِ قیامت تم انبیاء کرام' صدیقین' شہداء اور نیکوکاروں کے ساتھ اٹھائے جاؤ گے اور ان کے ساتھ جنت الفردوس میں تمہارا داخلہ ہوگا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ایسے لوگوں میں شامل فرمائے !وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّۃَ مَعَ الْاَبْرَارِ' یَا عَزِیْزُ یَا غَفَّارُ!!

نفاق کا نقطۂ آغاز

اس کے بعد اب وہ مضمون آ رہا ہے جو اس سے قبل کسی قدر تفصیل کے ساتھ منافقت کی وضاحت کے ضمن میں سورۃ المنافقون کے درس میں بیان ہو چکا ہے۔ یہاں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ سورۃ العنکبوت جس کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں' مکّی سورۃ ہے اور مکّی دَور کے بھی زیادہ سے زیادہ درمیانی عرصے میں اس کا نزول ہوا۔ اس اعتبار سے نفاق کی اس معروف صورت کا ابھی مسلمانوں کی صفوں میں کہیں دُور دُور تک نشان نہیں تھا جس کا بالعموم تصور ہمارے ذہنوں میں بیٹھا ہوا ہے کہ منافق وہ ہے جو مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی نیت سے اسلام قبول کرے' اس نے محض ظاہراً اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو' اندرونی طور پر وہ پکا کافر ہو' وغیرہ۔ مکّی دَور میں اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہاں تو کلمۂ شہادت کا زبان پر لانا معاشرے کو چیلنج کرنے اور اس کے خلاف اعلانِ بغاوت کرنے کے مترادف تھا۔ یہ گویا ایسے ہی تھا کہ کوئی انسان خود ہر

طرح کی مصیبت کو دعوت دے اور آگے بڑھ کر للکارے۔ لہٰذا اس معروف نفاق کا ابھی کہیں دُور دُور تک کوئی امکان نہیں تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کون سا نفاق ہے جس کا ذکر اس سورۂ مبارکہ میں ہو رہا ہے۔ یہ ہے درحقیقت وہ اصل نفاق جو کم ہمتی، بزدلی اور قوّتِ ارادی کی کمزوری سے عبارت ہے کہ اگرچہ ایمان جب قبول کیا تھا تو اس کی face value پر قبول کیا تھا، نبی ﷺ کی بات دل کو لگی تھی تبھی اسے تسلیم کیا تھا، لیکن پھر ایمان کے کٹھن تقاضے جب سامنے آنے لگے، مصائب، تکالیف اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا تو ان سے طبیعت گھبرانے لگی اور گریز کی طرف مائل ہونے لگی۔ اگر تو ان مشکلات کی وجہ سے کوئی انسان اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں پس و پیش کرنے لگے، دین کے راستے میں اس کے قدم رکنے لگیں اور گومگو کی سی کیفیت اس پر طاری ہو جائے تو یہی درحقیقت مرضِ نفاق کا نقطۂ آغاز ہے!

نفاق اور منافقت کا یہ نقطۂ آغاز اس آیۂ مبارکہ میں بڑی وضاحت سے سامنے آتا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ﴾

''لوگوں میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اللہ پر، پھر جب انہیں ایذا پہنچائی جاتی ہے اللہ کی راہ میں (کچھ انفاقِ مال اور بذلِ نفس یعنی جان و مال کے ایثار کا مرحلہ آتا ہے یا کوئی تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں) تو وہ لوگوں کی (طرف سے ڈالی ہوئی) اس آزمائش سے ایسے گھبرا اٹھتے ہیں جیسے اللہ کے عذاب سے گھبرانا چاہئے۔''

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اس رکوع میں فتنے کی دو نسبتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف منسوب کرتے ہیں کہ ہم نے فتنے میں ڈالا ہے، ہم تم سے پہلے لوگوں کو بھی آزماتے رہے ہیں ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ اور

دوسرے یہ کہ یہ فتنہ اور آزمائش لوگوں کی طرف سے ہے۔ یہ دونوں باتیں بیک وقت درست ہیں۔ اگرچہ یہ ابوجہل ہے جو مسلمانوں کو ستا رہا ہے' اور اُمیہ بن خلف ہے کہ جو تکالیف پہنچا رہا ہے' لیکن یہ بغیر اذنِ ربّ نہیں ہے۔ فاعل حقیقی اور مؤثر حقیقی تو اللہ ہے جس کے اذن کے بغیر پتّا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں چیزیں بیک وقت موجود ہیں۔ بلالؓ پر جو کچھ بیت رہا ہے عالمِ اسباب میں اس کا سبب اُمیہ بن خلف ہے۔ آلِ یاسرؓ پر جو قیامت ڈھائی جا رہی ہے اس کا ذمہ دار اس ظالمانہ عمل کا کمانے والا ابوجہل ہے لیکن فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے' آزمائش اس کی جانب سے ہے' گو اس کی یہ آزمائش ابوجہل کے ہاتھوں اور اُمیہ بن خلف ہی کے ذریعے سے اہل ایمان کو پہنچ رہی ہے۔ اس اعتبار سے فتنے کی یہ دونوں نسبتیں بیک وقت درست ہیں۔

اس آیت میں ان کم ہمت لوگوں کا ذکر ہے کہ جو لوگوں کی طرف سے ڈالی ہوئی آزمائش اور تکلیف سے ایسے گھبرا اٹھتے ہیں جیسے کہ اللہ کے عذاب سے گھبرانا چاہئے۔ ان تھڑ دلے لوگوں کی سیرت کا ایک دوسرا رُخ اگلے الفاظ میں واضح کیا گیا:

﴿وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ﴾

''اور اگر تمہارے ربّ کی طرف سے کوئی مدد آ جائے تو یہ ضرور کہیں گے کہ ہم یقیناً تمہارے ساتھ تھے۔''

کہ آزمائش کا وقت آتا ہے تو پیچھے ہٹتے ہیں' لیکن اگر کہیں کوئی فتح نصیب ہو جائے' اللہ کی مدد آ جائے' کوئی مالِ غنیمت ہاتھ لگ جائے تو وہ پیش پیش ہوں گے اور کہیں گے کہ آخر ہم بھی تمہارے ساتھ تھے' ہم بھی ان ثمرات سے متمتع ہونے کا حق رکھتے ہیں' ہمیں بھی اس مالِ غنیمت سے میں سے پورا پورا حصّہ ملنا چاہئے۔ یہ ایک کردار ہے جو کسی ایک معیّن دَور سے متعلق نہیں ہے بلکہ ہر انقلابی تحریک کے ساتھ وابستہ ہونے والوں میں یہ کردار بھی ہوتا ہے۔

تین قسم کے کردار

ہر انقلابی دعوت اور انقلابی جدوجہد میں تین کردار بالکل نمایاں طور پر ہوتے

ہیں۔ ایک وہ جو اِس دعوت کو ہرچہ بادا باد کی شان کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔

ع ''ہرچہ بادا باد ما کشتی درآب اندا ختیم''

کہ اب جو ہو سو ہو، ہم نے کشتی پانی میں ڈال دی ہے' اب یہ تیرے گی تو ہم تیریں گے اور یہ ڈوبے گی تو ہم بھی ساتھ ہی ڈوبیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس انقلابی جدوجہد اور اس کے مقصد (cause) کے ساتھ ذہناً اور عملاً پورے طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو اس نظامِ کہنہ اور نظامِ باطل کو بچانے کے لئے میدان میں آتے ہیں اور کھلم کھلا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو پورے طور پر اس باطل نظام کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں اور اس کے حمایتی بن کر کھڑے ہوتے ہیں کہ جو پہلے سے قائم ہے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ ایک دوسرے کے مدمقابل آتے ہیں اور اس طرح کشمکش و کشاکش کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام مجاہدہ ہے اور اس کشاکش میں بالعموم جنگ و قتال کی نوبت بھی آتی ہے۔ ایک تیسرا عنصر درمیان درمیان میں رہتا ہے۔ وہ اس فیصلہ کن انداز میں بازی کھیلنے کا قائل ہی نہیں' اس لئے کہ اسے ہر حال میں اپنے مفادات عزیز ہیں۔ قرآن حکیم میں ایسے شخص کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا: ﴿لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ﴾ کہ نہ وہ اِدھر اپنے آپ کو وابستہ اور identify کرنے پر آمادہ ہے' نہ اُدھر یکسو ہو کر ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہے بلکہ وہ ان کے بین بین رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس بات کا انتظار کرتا ہے کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس کی حکمت عملی یہ ہوتی ہے کہ دونوں پارٹیوں کے ساتھ روابط رکھے تاکہ جس کسی کو بھی فتح نصیب ہو وہ ان کے پاس جا کر اپنی وفاداری یا اپنی سابقہ خدمات کا حوالہ دے کر اپنے لئے تحفظات اور مراعات حاصل کر سکے۔ یہ ہے وہ منافقانہ کردار جس کو خوب اچھی طرح پہچاننے کی ضرورت ہے! اسی کردار سے پیشگی متنبہ کیا جا رہا ہے کہ:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ﴾

کہ یہ دراصل اس مرض اور قلبی روگ کا نقطۂ آغاز ہے جو آگے بڑھ کر منافقت کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ آگے فرمایا:

﴿اَوَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَعۡلَمَ بِمَا فِیۡ صُدُوۡرِ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾

''تو کیا اللہ تعالیٰ زیادہ باخبر نہیں ہے اس سے کہ جو کچھ جہان والوں کے سینوں میں پنہاں ہے؟''

جہان والوں کے سینوں کے پوشیدہ اسرار سے اللہ سے بڑھ کر کون واقف ہوگا؟ یہ لوگ اپنی غلط بیانی سے کسے دھوکہ دینا چاہتے ہیں' کس کو فریب دینا چاہ رہے ہیں!! سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر۹ میں اس فریب کاری کا پردہ چاک کر دیا گیا:

﴿یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ وَمَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَہُمۡ ......﴾

''کہ یہ دھوکہ دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور اہل ایمان کو' درآنحالیکہ یہ دھوکہ نہیں دے رہے مگر خود اپنے آپ کو......''

سیدھی سی بات ہے کہ اگر تو معاملہ اللہ کے ہاتھ ہے تو وہ کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے' وہ تو لوگوں کے سینوں میں پوشیدہ باتوں سے بھی بخوبی آگاہ اور ان کی نیتوں اور ارادوں سے بھی خوب اچھی طرح واقف ہے۔

جھوٹا مدعیٔ ایمان کون؟

اور اب اگلی آیت کے مطالعے سے پہلے ذرا ذہن میں لایئے آیت۳ کا آخری حصّہ' جس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں: ﴿فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَلَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ﴾ کہ اللہ بالکل کھول کر رکھ دے گا' ظاہر کر دے گا کہ کون سچے ہیں اور کون جھوٹے۔ وہاں سچے اور جھوٹے سے حقیقتاً جو مراد تھی یہاں اس پر سے پردہ اٹھا دیا گیا اور بات بالکل کھول دی گئی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَیَعۡلَمَنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ﴾

کہ اللہ کھول کر رہے گا' الم نشرح کر دے گا' بالکل واضح کر دے گا کہ کون ہیں وہ جو واقعتاً صاحب ایمان ہیں' حقیقتاً مؤمن ہیں' جو قلب و ذہن کی یکسوئی کے ساتھ ایمان

لائے ہیں‘ جو اس عزمِ مصمم کے ساتھ آئے ہیں کہ ہر چہ بادا باد! اور وہ کون ہیں جنہوں نے اس وادی میں قدم رکھا تو ہے لیکن تحفظات کے ساتھ! جنہیں اس راہ کے مصائب و مشکلات کے مقابلے میں جان و مال کا تحفظ زیادہ عزیز ہے‘ جنہوں نے گوہ کے بل کی طرح اپنے لئے دونوں راستے کھلے رکھے ہیں کہ حالات کا اونٹ خواہ کسی کروٹ بیٹھے انہوں نے اپنے تحفظ کا سامان کیا ہوا ہے‘ جن کی کم ہمتی اور بودے پن کا یہ عالم ہے کہ اللہ کی راہ میں جیسے ہی کوئی آزمائش آتی ہے وہ اس طرح گھبرا اٹھتے ہیں جیسے کوئی آسمانی آفت ٹوٹ پڑی ہو!

پھر نوٹ کر لیجئے کہ اگرچہ یہ مکّی سورت ہے‘ اور مکّی دَور کے بھی وسطی حصّے سے اس کا تعلق ہے جبکہ ابھی اس نفاق کا دُور دُور تک امکان نہیں تھا جو بعد میں مدنی دَور میں پورے طور سے ظاہر ہوا‘ لیکن یہاں صاف الفاظ میں ’نفاق‘ اور ’منافقت‘ کا ذکر موجود ہے۔ گویا پیشگی متنبہ کر دیا گیا کہ اس راہ میں اگر کم ہمتی کا مظاہرہ کیا جائے تو یہ طرزِ عمل انسان کو منافقت کی آخری سرحدوں تک لے جا سکتا ہے۔

نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا ایک پُرفریب انداز

اس کے بعد انہی نوجوانوں کا ایک اور مسئلہ زیرِ بحث آ رہا ہے جن پر ان کے والدین کا دباؤ تو تھا ہی‘ ان کے بڑے اور بزرگ بڑے ہی ناصحانہ اور مشفقانہ انداز میں ایک بات ان سے کہتے تھے جس کا قرآن نے یہاں حوالہ دیا ہے۔ یہ وہ معاملہ ہے جس کا تجربہ ہر اُس نوجوان کو ہو گا جو کسی بھی انقلابی دعوت سے منسلک ہو۔ یہ باتیں وہ ہیں کہ جن سے ہر انقلابی جدوجہد میں فی الواقع سابقہ پیش آتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ﴾

”اور کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا (جو کفر کی روش پر قائم تھے) ان لوگوں سے کہ جو ایمان لائے تھے کہ اتباع کئے جاؤ ہمارے ہی راستے کا اور ہم اٹھا لیں گے تمہاری خطاؤں کا بوجھ۔“

یہ نوجوانوں کو بہکانے اور ورغلانے کا ایک انداز تھا جو قوم کے ان بڑے بوڑھوں نے

اختیار کیا جو خود شرک پر قائم تھے۔ وہ بڑے مشفق اور خیر خواہ بن کر ان نوجوانوں سے کہ جو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے تھے‘ یہ کہتے تھے کہ بالکل بے فکر ہو کر چلے آؤ اپنے آباء واجداد کے راستے پر‘ آنکھیں بند کر کے ہمارے پیچھے چلتے رہو‘ ہماری پیروی کرتے رہو‘ ہم ہی حق پر ہیں‘ آخر اپنے آباء واجداد کے راستے کو کیوں ترک کرتے ہو!! پھر مزید ترغیب کے طور پر اتمامِ حجت کے انداز میں وہ کہتے تھے کہ اگر واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے آباء واجداد کا یہ راستہ غلط ہے اور تمہاری سمجھ میں ہماری بات نہیں آ رہی تو بھی ذرا سوچو کہ اگر تمہاری ساری ذمہ داری ہم اٹھا لیں تو پھر تمہارے لئے تشویش کا کون سا معاملہ باقی رہ جاتا ہے؟ مطمئن رہو‘ ہم خدا کے ہاں تمہاری طرف سے جواب دہی کریں گے‘ تمہاری ذمہ داری ہم قبول کریں گے۔ اگر فی الواقع ہم غلطی پر ہوئے تو بھی گھبراؤ نہیں‘ تمہاری خطاؤں کا بوجھ ہماری گردنوں پر ہوگا۔ فرمایا:

﴿وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝﴾

''اور نہیں ہیں وہ اٹھانے والے ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی۔ بلاشبہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔''

وہاں تو ہر ایک کو اپنی جواب دہی کرنی ہے‘ کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں۔ یہ سراسر جھوٹ بول رہے ہیں‘ دوسروں کو فریب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں جس شدّت کے ساتھ ان کے دعوے کی نفی کی گئی ہے اور اگلی آیت میں جس طرح اللہ تعالیٰ کا غضب اُن پر ظاہر ہو رہا ہے‘ اس کے پس منظر میں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اس طرزِ خطاب میں اور فریب آمیز طرزِ تکلم میں واقعتاً کچھ لوگوں کے لئے کچھ وزن تھا۔ آخر جب قوم کے بڑے بوڑھے کوئی بات اپنے تجربے کے حوالے سے کہتے ہیں تو ان کی بات بالعموم توجہ سے سنی جاتی ہے۔ دعوتِ حق پر کان دھرنے والے نوجوانوں پر اثر انداز ہونے کے لئے بزرگانِ قوم کی گفتگو کا انداز ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ میاں ہم نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے‘ ہم نے دنیا دیکھی ہے‘ تم ابھی نوعمری کے دَور میں ہو‘

---

(۱)

تمہیں اپنے نفع ونقصان کی ابھی سمجھ نہیں ہے‘ کوئی سر پھرا شخص ہے جو تمہیں غلط راستے پر ڈال رہا ہے‘ وہ تمہاری دنیا برباد کر کے رکھ دے گا‘ ہمارے راستے پر آ ؤ! ہم تمہاری رہنمائی کریں گے۔ یہ وہ باتیں ہیں جوان کی طرف سے سننے میں آتی ہیں اور اس بات کا امکان ہر دم رہتا ہے کہ کسی وقت انسان اگر کسی خاص کیفیت میں ہو اور ان بزرگوں کے ساتھ اس کے حسنِ ظن کا رشتہ برقرار ہو تو وہ ان سے کوئی اثر قبول کر لے۔ لہٰذا پوری شدت کے ساتھ ان کے دعوے کی نفی کی گئی اور ان کے فریب کا پردہ چاک کر دیا گیا کہ ﴿اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ ’’بلاشبہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں!‘‘ دروغ گوئی سے کام لے رہے ہیں!!

اپنا بوجھ خود اٹھانا ہوگا

اس دورِ زوال میں جبکہ بہت سے دینی تصورات مسخ ہو گئے ہیں‘ ہمارے ذہنوں میں بالعموم یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ روزِ محشر کوئی وہاں ہمیں چھڑا لے گا اور ہمارا بوجھ اٹھا لے گا‘ کسی کے دامن سے وابستہ ہو کر نکل جائیں گے اور اس طرح ہمارا بیڑا پار ہو جائے گا۔ یہ تمام تصورات ایک طرف رکھئے اور قرآن مجید کا انداز دیکھئے! ﴿وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ﴾ ’’اور وہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں ہوں گے‘‘۔ جیسے ایک جگہ فرمایا: ﴿لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ ’’کوئی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہ ہوگا‘‘۔ وہاں تو اپنی اپنی گٹھڑی ہوگی اور اپنا اپنا کاندھا۔ ہر ایک کو اپنے بوجھ خود اٹھانے پڑیں گے۔ ہر شخص کو اپنی جواب دہی خود کرنی ہوگی: ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا﴾ قیامت میں ہر شخص کو اپنی انفرادی حیثیت میں پیش ہونا ہوگا اور اسی اعتبار سے اس کا محاسبہ ہوگا کہ تم کیا تھے؟ کہاں تھے؟ تمہاری صلاحیتوں کا مصرف کیا ہوا؟ تمہیں ہم نے جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا فرمائی تھی اس سے کتنا کچھ فائدہ اٹھایا؟ یہ دلیل وہاں ہرگز قبول نہیں ہوگی کہ ہم نے تو اپنے بزرگوں کے نقش قدم کی پیروی کی تھی‘ اگر ہم غلطی پر تھے تو اس کے ذمہ دار ہمارے بڑے بزرگ ہیں‘ ہم نہیں ہیں!!

اضافی بوجھ اٹھانے والے!

اب اگلی آیت پر اپنی توجہ مرکوز کیجئے! مشرکین کے اس گھناؤنے کردار پر اللہ کا غضب بہت نمایاں ہے:

﴿وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۡ﴾

''یہ لوگ لازماً اٹھائیں گے اپنے بوجھ' اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور کچھ بوجھ بھی (انہیں اٹھانے ہوں گے)''

نوجوانوں کو فکری طور پر داغ دار کرنے اور گمراہ کرنے کی یہ کوشش' ان کو غلط راستے پر ڈالنے کی یہ سعی یقیناً ان کے اپنے گناہوں کے بوجھ میں اضافے کا باعث بنے گی۔ اس سے ان کی ذمہ داری بلاشبہ بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ نوجوان جو اِن کے فریب میں آ کر اپنی منزل کھوٹی کر رہے ہیں اپنی ذمہ داری سے دستکش ہو سکیں گے اور بازپُرس سے بچ جائیں گے۔ نہیں' ان کی ذمہ داری میں ہرگز کمی نہیں آئے گی۔ انہیں اپنے فیصلے کی پوری ذمہ داری قبول کرنی پڑے گی۔ یہ دلیل کہ کسی نے مجھے اس گمراہی کے راستے پر ڈالا' اللہ کے ہاں کوئی وزن نہیں رکھتی۔ ہر شخص کو جو کچھ دیا گیا ہے' جو جسمانی صلاحیتیں اور ذہن وفکر کی قوّتیں عطا کی گئی ہیں' ان کی بنیاد پر وہ خود انفرادی حیثیت میں مسئول ہے۔ ہاں وہ لوگ جو دوسروں کو گمراہ کرنے اور انہیں غلط راستے پر ڈالنے کی سعی کر رہے ہیں' اپنے اس طرزِ عمل سے اپنے بوجھ میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں' انہیں اپنی خطاؤں کے ساتھ ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھانا ہو گا جو ان کی باتوں میں آ کر گمراہی کا شکار ہو گئے تھے' یہ اضافی بوجھ بھی ان کے سروں پر ہو گا! یہ آیت مبارکہ ان الفاظ پر ختم ہو رہی ہے:

﴿وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ۝﴾

''اور لازماً ان سے بازپُرس ہو کر رہے گی قیامت کے دن اس افترا کے بارے میں جو وہ کرتے ہیں۔''

جو جھوٹ یہ گھڑ رہے تھے' جو افترا پردازیاں کر رہے تھے اور جو غلط دعوے کر رہے تھے

کہ ہم تمہارا بوجھ اٹھائیں گے' اس سب کے بارے میں انہیں جواب دہی کرنی پڑے گی۔ ان سے اس معاملے میں باز پُرس ہو کر رہے گی!

پہلے رکوع کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

آپ نے دیکھا کہ اگر سلسلۂ کلام معیّن ہو جائے' سیاق وسباق واضح ہو جائے کہ کن حالات میں گفتگو ہو رہی ہے' اس وقت کیا مسائل درپیش تھے' اور کون لوگ ہیں جن کی طرف روئے سخن ہے تو قرآن مجید کی ایک ایک آیت کس طرح خود بولتی ہے اور کس طرح اس کی آیات کے مابین ایک ربط اور تعلق قائم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک مربوط اور مسلسل کلام ہے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ قرآن مجید کا نزول ایک خاص قوم کے مابین ایک خاص ماحول میں ہوا ہے۔ اس کے نزول کے ساتھ ساتھ ایک خاص جماعت تیار ہو رہی تھی جسے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ایک منظّم قوّت کے طور پر تیار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم ان کے احساسات اور ان کے مسائل ومعاملات کو وقتاً فوقتاً' وقفے وقفے سے زیرِ بحث لاتا ہے۔

سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع میں ان مسائل و مشکلات' ان امتحانات' ان آزمائشوں' ان تکالیف اور مصیبتوں کے ضمن میں ایک مکمل ہدایت نامہ موجود ہے کہ ان کے بارے میں اہل ایمان کا نقطۂ نظر کیا ہونا چاہئے۔ چنانچہ ان پر واضح کیا جا رہا ہے کہ یہ تمہارے ایمان کی آزمائش ہے۔ تمہارے ایمان کی صداقت کا ثبوت اسی سے مہیا ہو گا۔ یہ امتحان تمہارے جذبۂ ایمانی کی تربیت کے لئے بھی مطلوب ہے۔ اور یہ آزمائش اصلاً اللہ کی طرف سے ہے' اگرچہ بظاہر یہ اللہ کے دشمنوں کے ہاتھوں تم تک پہنچ رہی ہے۔ اور پھر یہ بھی نہ سمجھو کہ تمہیں ایذائیں دے کر وہ بری ہو جائیں گے' ان کو لازماً پکڑا جائے گا۔ ابھی اللہ کی حکمت میں ان کی رسّی دراز کرنا ہے۔ وہ تمہیں اُس وقت تک ستا سکیں گے جب تک اللہ چاہے گا۔ اور ایک وقت لازماً آئے گا کہ وہ اللہ کی گرفت میں آئیں گے ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ﴾ ''تمہارے ربّ کی پکڑ بہت سخت ہے''۔ اگر انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ اس سے بچ نکلیں گے تو بڑا غلط فیصلہ کیا ہے۔ پھر

ایمان کی حقیقت بھی بیان فرما دی گئی اور ایمان اور عمل صالح کے تقاضے پورے کرنے والوں کے لئے بہترین اجر کی بشارت بھی دی گئی۔ یہ سب کچھ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کو صبر کی تلقین ہی تو ہے۔

ہمارے اس منتخب نصاب کا نقطۂ آغاز سورۃ العصر ہے‘ جس میں ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ساتھ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کو بھی لوازمِ نجات میں سے شمار کیا گیا ہے:

﴿وَالْعَصْرِ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۝﴾

سورۃ العنکبوت کا یہ مقام دراصل ’’تواصی بالصبر‘‘ کے لئے انتہائی خوبصورت افتتاحی سبق ہے۔ یہاں تواصی بالصبر کا فریضہ گویا اللہ تعالیٰ خود سرانجام دے رہے ہیں۔ اہل ایمان کو صبر و ثبات کی تلقین کی جا رہی ہے کہ اپنے قول پر ڈٹے رہو‘ جمے رہو‘ اپنے دعوائے ایمان میں اس طور سے ثابت قدم رہو کہ تمہارے پائے ثبات میں کہیں کوئی لرزش نہ آنے پائے۔

رکوع ۲ تا ۴ کے مضامین کا مختصر جائزہ

یہ سورۂ مبارکہ ایک خاص پہلو سے انہی مضامین پر مشتمل ہے۔ اس منتخب نصاب میں اس کا تو امکان نہیں ہے کہ سات رکوعوں پر مشتمل اس پوری سورۂ مبارکہ کا درس شامل کیا جا سکے‘ تاہم پہلے رکوع کے علاوہ ہم اس کی مزید چند آیات کا مطالعہ بھی کریں گے۔ دوسرے‘ تیسرے اور چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رُسل کے حالات سے استشہاد فرمایا ہے۔ گویا کہ مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ تم پہلی اُمت نہیں ہو‘ نہ محمد ﷺ اللہ کے پہلے رسول ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الاحقاف میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ﴾ یعنی اے نبیؐ! کہہ دیجئے کہ مَیں کوئی نیا نویلا رسول نہیں ہوں۔ بہت سے رسول آپؐ سے پہلے آئے ہیں۔ یا جیسے سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ یعنی ’’محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں اور آپؐ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں‘‘۔

ان رسولوں کے ساتھ بھی یہ تمام حالات پیش آئے۔ ان پر ایمان لانے والوں کو بھی ان تمام گھاٹیوں سے گزرنا پڑا اور وہ ان تمام آزمائشوں کے مراحل سے دوچار ہوئے۔ چنانچہ ایک ایک کا نام لے کر بہت سے انبیاء ورُسل کا تذکرہ کیا گیا۔ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر آیا اور اس ضمن میں خاص طور پر یہ بات نمایاں کی گئی کہ ان کی استقامت بے مثل تھی کہ انہوں نے ساڑھے نو سو برس اپنی قوم میں گزارے۔ مسلسل اعراض، مسلسل انکار، استہزاء اور تمسخر سے ان کا سابقہ رہا، لیکن ہمارا وہ بندہ ثابت قدم رہا۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان آتی ہے۔ کون سی آزمائش ہے جس سے آپؑ نہیں گزرے۔ گھر سے انہیں نکالا گیا۔ مشرک باپ نے زجر و ملامت کے انداز میں ان سے کہا: ﴿لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكَ وَاهۡجُرۡنِیۡ مَلِیًّا﴾ یعنی ''اے ابراہیم! اگر تم (میرے ان خداؤں کی مخالفت سے) باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا اور یہ کہ تم فی الفور میری نگاہوں سے دُور ہو جاؤ!'' پھر کون سا ایسا کٹھن مرحلہ ہے جو ان پر نہیں گزرا۔ بادشاہِ وقت کے دربار میں پیشی ان کی ہو رہی ہے، آگ کے الاؤ میں وہ جھونکے جا رہے ہیں، اپنا وطن خیرباد کہہ کر پوری زندگی ایک مسافرت کے عالم میں وہ بسر کر رہے ہیں۔ آج یہاں ہیں، کل وہاں ہیں، کبھی شام کے بالائی علاقے میں ہیں، کبھی فلسطین میں آ کر ڈیرے لگائے ہیں تو کبھی مصر میں ہیں۔ حجاز میں دعوتِ توحید کا ایک مرکز تعمیر کیا ہے۔ دوسرے بیٹے کو فلسطین میں بٹھا دیا ہے۔ اللہ کا یہ بندہؑ اپنے اس یقین پر قائم ہے کہ اس کا تعلق اپنے گھر والوں سے نہیں، آباء و اجداد سے نہیں، کسی زمین سے نہیں، کسی وطن سے نہیں، اس کا تعلق صرف اور صرف خدائے واحد کے ساتھ ہے۔ اللہ کا وہ بندہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اس آخری امتحان سے بھی گزرا کہ عین بڑھاپے کے عالم میں دعائیں مانگ مانگ کر جو اکلوتا بیٹا لیا تھا اللہ نے اس کے ضمن میں بھی آزمالیا کہ کہیں اس کی محبت ابراہیمؑ کے دل میں میری محبت سے زیادہ تو نہیں ہو گئی۔ تو یہ آزمائش اور امتحان تو اس راہ کا ایک مستقل ضابطہ اور قانون ہے، اس میں کوئی

استثناء نہیں ہے' جو ادھر آئے گا آزمایا جائے گا۔ یہاں انبیاء و رُسل کے حالات کا ذکر گویا ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ کی تفسیر ہے۔

اہل ایمان کے لئے خصوصی ہدایات

انبیاء اور رُسل کے احوال بیان کرنے کے بعد پانچویں رکوع میں آیت نمبر ۴۵ سے کہ جہاں سے اکیسویں پارے کا آغاز ہوا ہے' ایک نہایت اہم مضمون شروع ہوتا ہے کہ اس قسم کے حالات میں اہل ایمان کو کرنا کیا چاہئے۔ اس ضمن میں بعض معین ہدایات مسلمانوں کو دی جا رہی ہیں۔ اجمالاً یہاں اس میں سے صرف چند آیات کا حوالہ دینا مفید رہے گا۔ ظاہر بات ہے کہ اس پوری عبارت کو جو تین رکوعوں پر مشتمل ہے' ہم اس مختصر نصاب میں شامل نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے کی پہلی ہدایت اکیسویں پارے کے بالکل آغاز میں وارد ہوئی ہے:

﴿اُتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ۝﴾

''(اے نبیؐ!) تلاوت کیا کرو اس کی جو وحی کیا گیا ہے تمہاری جانب کتابِ الٰہی میں سے اور نماز قائم رکھو' یقیناً نماز برائی سے اور بے حیائی سے روکنے والی ہے۔ اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تم کر رہے ہو۔''

یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ المنافقون میں ہم پڑھ چکے ہیں' یعنی ذکر الٰہی کا التزام۔ اس کٹھن راستے میں ہمدم' غم خوار' پشت پناہ اور ہمت بندھانے والا اگر کوئی ہے تو وہ اللہ کا ذکر ہے۔ وہاں فرمایا گیا تھا کہ:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۝﴾

''اے مسلمانو! دیکھنا تمہارا مال اور تمہاری اولاد کہیں تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ اس لئے کہ جو اس فتنے میں گرفتار ہو گیا تو وہی ہے خسارہ پانے والا۔''

یہاں فرمایا کہ مشکل اور کٹھن حالات میں تمہارے لئے اصل سہارا تلاوتِ قرآن اور ادائے صلوۃ ہے' اور یہ دونوں ذکر کی اعلیٰ ترین صورتیں ہیں۔ قرآن حکیم مجسم ذکر ہے۔ یہ ''الذکر'' بھی ہے اور ''ذکریٰ'' بھی! اس کی تلاوت پر کاربند رہنا' اس کو پڑھتے رہنا ذکر کی نہایت عمدہ صورت ہے۔ پھر یہ کہ جامع ترین ذکر ہے نماز۔ اس میں ذکرِ قولی بھی ہے اور ذکرِ عملی بھی۔ اس میں اپنی زبان سے اللہ کو یاد کرنا بھی ہے اور اس کے سامنے اظہارِ بندگی کے طور پر جھک جانا یعنی رکوع اور سجود بھی ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ کہ اس راہ میں ہمت بندھانے والی اور ثابت قدم رکھنے والی سب سے بڑی چیز بلاشبہ ''اللہ کی یاد'' ہے۔

اس سلسلے کی دوسری اہم ہدایت اس سلسلۂ کلام میں ذرا آگے چل کر وارد ہوئی ہے۔ یہ آیت نمبر ۵۶ ہے جس میں ہجرت کی طرف اشارہ بھی موجود ہے۔ فرمایا:

﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۝﴾

''اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین بہت کشادہ ہے' پس تم صرف میری بندگی کرو۔''

کہ اگر کسی ایک مقام پر تمہارے لئے توحید پر کاربند رہنا ناممکن بنا دیا گیا ہو تو تم اس زمین کے ساتھ بندھے نہ رہو' وہ شہر' وہ ملک یا وہ خطۂ ارضی تمہارے قدموں کو روک نہ لے' باندھ نہ لے' بلکہ تم ہجرت کر جاؤ۔ اس لئے کہ بہر صورت تمہیں بندگی میری ہی کرنی ہے۔ اس آیۂ مبارکہ میں گویا کہ مسلمانوں کو ہدایت دے دی گئی اور صاف الفاظ میں اشارہ کر دیا گیا کہ اگر مکّہ کی سرزمین تم پر تنگ ہوگئی ہے اور یہاں رہ کر توحید پر کاربند رہنا تمہارے لئے مشکل بنا دیا گیا ہے تو اس سرزمین کو خیر باد کہو اور ہجرت کر جاؤ۔ درحقیقت اسی ہدایت اور رہنمائی کے تحت ہجرتِ حبشہ واقع ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ نے اہلِ ایمان کو یہ اجازت دی کہ وہ مکّہ سے چلے جائیں اور حبشہ میں جا کر پناہ گزین ہو جائیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے دو قافلے حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان ہجرت کرنے والوں میں شامل تھے۔ اس سورۂ مبارکہ میں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاص طور پر جو ذکر آیا ہے‘ جس طریقے سے ان کی زندگی مسلسل مہاجرت میں گزری ہے‘ یہ حکم گویا اسی کا ایک عکس ہے۔ آگے فرمایا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ قف ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ۝﴾

’’ہر ایک کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے‘ پھر تم سب ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔‘‘

کہ یہ زندگی عارضی ہے‘ تکلیفوں اور مشقتوں میں بھی بیت جائے گی اور آرام و آسائش کے ساتھ بھی بہر حال ختم ہو کر رہے گی۔ پھر تم سب ہماری طرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔ موت کا خوف اگر ہجرت کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے تو اسے ذہن سے جھٹک دو‘ موت تو بہر صورت آ کر رہے گی۔

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ۝﴾

پھر دیکھئے وہی مؤکد وعدہ جو پہلے رکوع میں دو مرتبہ آیا تھا‘ یہاں سورۃ کے آخری حصّے میں بھی موجود ہے: ’’اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے (یعنی ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کیا) ہم لازماً ان کو ٹھکانہ دیں گے جنت کے بالا خانوں میں‘‘۔ نوٹ کیجئے‘ ہجرت کے ساتھ اس لفظ ’’لَنُبَوِّئَنَّهُمْ‘‘ کی بڑی مناسبت ہے۔ ’’بَوَّءَ۔ يُبَوِّءُ‘‘ کے معنی ہیں کہیں ٹھکانہ فراہم کرنا۔ ’’ہم ان کے لئے ٹھکانہ بنائیں گے جنت کے ان بالا خانوں میں (بہشت کے ان جھروکوں میں) جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی‘ اور کیا ہی عمدہ ہے یہ بدلہ عمل کرنے والوں کا‘‘۔ اور یہ عمل کرنے والے کون ہیں؟ ساتھ ہی واضح فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۝﴾ وہ لوگ جنہوں نے صبر کی روش اختیار کی‘ جو ثابت قدم رہے‘ نہ کسی تشدد اور مخالفت سے بددل ہوئے نہ کسی لالچ اور temptation سے انہوں نے اپنی منزل کھوٹی کی۔ ان کا توکل صرف اپنے ربّ پر تھا‘ ان کی تمام امیدیں صرف اسی کی ذات سے وابستہ رہیں اور وہ اسی کی پکڑ سے ڈرتے رہے!

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوید جانفزا

یہ سورۂ مبارکہ ختم ہوتی ہے ایک ایسی نوید جانفزا پر جو ہر اُس بندۂ مؤمن کے لئے ہے کہ جو اِس قسم کی کسی کشمکش میں عملاً مبتلا ہو اور صبر و مصابرت کے ان امتحانات سے اور آزمائشوں اور تکالیف کے اس دَور میں سے گزر رہا ہو۔ ایسے شخص کے لئے اس سے بڑی نوید جانفزا اور اس سے زیادہ قطعی یقین دہانی کی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۝﴾

''اور وہ لوگ جو ہماری راہ میں جہاد کریں گے ہم ان کے لئے اپنے راستے کھولتے جائیں گے۔ اور بے شک اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے۔''

پھر نوٹ کیجئے لفظ ''جہاد'' مکّی سورت میں وارد ہوا ہے جب کہ ابھی قتال کا دُور دُور تک کہیں کوئی سوال نہیں تھا۔ یہ مجاہدہ' یہ کشمکش اور یہ تصادم درحقیقت نظریات کی سطح پر ہو رہا ہے۔ صبر کا صبر کے ساتھ مقابلہ ہو رہا ہے۔ وہ لوگ اپنے نظامِ باطل کے تحفظ میں اپنی قوّتوں کو مجتمع کر رہے ہیں' یہاں اہل ایمان ہیں جو اپنے ایمان کے لئے' اپنے ربّ کے کلمے اور اس کے دین کی سربلندی کے لئے جان توڑ کوششیں کر رہے ہیں۔ دینِ حق کے ان سرفروشوں سے ہمارا پختہ وعدہ ہے کہ ﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ دیکھئے' یہاں تاکید کا وہی آخری اسلوب ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے شروع میں بھی یہ صیغۂ تاکید بتکرار آیا ہے اور یہاں آخر میں پھر یہ اسلوب اختیار کیا گیا: ﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ ''ایسے لوگوں کے لئے ہم لازماً اپنے راستے کھولتے چلے جائیں گے''۔ یہ ایک بہت اہم بات ہے' بہت اعلیٰ اور عمدہ وعدہ ہے جو مسلمانوں سے کیا جا رہا ہے۔ قدم بڑھاؤ تو سہی' آگے کی منزلوں کے بارے میں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں' اللہ تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں اپنے راستے پر چلائے گا' تمہارے لئے وہاں سے راستے کھولے گا جہاں سے کوئی راستہ کسی کو نظر نہ آتا ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر نگاہ ڈالئے' ہجرت سے قبل سن دس گیارہ نبوی میں بالکل ایسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کہیں کوئی راستہ دُور دُور تک نظر نہ آ رہا ہو۔ مکّہ سے مایوس ہو کر آپؐ طائف تشریف لے گئے۔ وہاں جو کچھ ہوا اور جس طور سے ہوا وہ سب کے علم میں ہے۔ زبانی مخالفت پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا' آپؐ پر پتھراؤ بھی کیا گیا'

یہاں تک کہ جسمِ اطہر لہولہان ہو گیا۔ واپس آئے تو مکّہ میں حالات اس درجے مخدوش تھے کہ ایک مشرک کی امان لے کر مکّہ میں داخل ہوئے' اس لئے کہ آپؐ کے قتل کی سازش تیار ہو چکی تھی' تمام راستے گویا بند ہو چکے تھے' امید کی کوئی کرن دُور دُور نظر نہیں آتی تھی' لیکن اللہ تعالیٰ نے گھر بیٹھے راستہ کھول دیا۔ مدینہ منورہ سے چھ افراد آئے اور ایمان لے آئے۔ اگلے سال بارہ آئے' بیعت ہوگئی۔ اس سے اگلے سال بہتر (۷۲) یا پچھتر (۷۵) افراد آئے اور مشرف با سلام ہو گئے۔ گویا مدینہ منورہ کا دارالہجرت بننا مقدر ہو رہا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے لئے ٹھکانہ اور جائے پناہ بنانے کا فیصلہ صادر فرما چکا ہے۔ وہاں محمد رسول اللہ ﷺ کے قدم ہائے مبارک ابھی پہنچے بھی نہیں لیکن آپؐ کے استقبال کی وہاں تیاریاں ہو رہی ہیں اور ایمان کو تمکن حاصل ہو چکا ہے۔ یہ ہے اللہ کا وہ پختہ وعدہ جس کا عملی ظہور اس صورت میں ہوا۔ بندۂ مؤمن کا فرض یہ ہے کہ اپنے حالات کے مطابق جو کچھ وہ کر سکتا ہے کر گزرے' نتائج کو اللہ کے حوالے کرے۔ آئندہ کہاں سے راستہ نکلے گا' اس کے بارے میں اسے خود فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ نے یہ چیز اپنے ذمے لے لی ہے: ﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ ''اور ہم لازماً کھولتے چلے جائیں گے ان کے لئے اپنے راستے!''

وآخر دعوانا ان الحَمد للّٰہ ربِّ العالمین OO